سہ ماہی

الاقربا

اسلام آباد

الاقربا فاؤنڈیشن، اسلام آباد

ڈاکٹر عشرت حسین، گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان
کو خراجِ تحسین
ایچ بی ایف سی کی آن لائن سہولت

On-line Application Submission

قرضے کی درخواست دینے کی آن لائن سہولت

Application Tracking System

قرضے کی درخواست نمٹائے جانے کے عمل کا آن لائن جائزہ

On-line Account Verification

پاس ورڈ کے ذریعہ آپ کی ادائیگی / قرضے کے اکاؤنٹ کی آن لائن تصدیق کا آغاز "گھر آسان" اور "گھر شاندار" اسکیموں سے

ملک میں جاری مختلف تعمیراتی منصوبوں، اپارٹمنٹس، عمارتوں اور ہاؤسنگ اسکیموں سے متعلق معلومات کی فراہمی کا بندوبست اور پہلے سے منظور شدہ رہائشی منصوبوں کے لئے قرضے کی درخواست دینے کی سہولت

Product for Overseas Pakistanis

بیرون ملک مقیم پاکستانی ایچ بی ایف سی ویب سائٹ کے ذریعے پروجیکٹس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں، اپنی پسند کے مکان / پروجیکٹ کا انتخاب کر کے اپنی درخواست آن لائن دے سکتے ہیں۔ ایچ بی ایف سی انہیں دستاویزات کی تیاری میں تکنیکی / قانونی امداد بھی فراہم کرے گی۔

ملاحظہ کریں ویب سائٹ **www.hbfc.com.pk**

HOUSE BUILDING FINANCE CORPORATION

Registered Office: 3rd Floor, Finance & Trade Centre, Sharea Faisal, Karachi-74400

Toll Free No: 0800-60006 (For Karachi, Lahore & Islamabad)

Phone: 9202301-5 Fax: 021-9202359-60

the Housing Bank for

SMH FINANCE

Small Medium Housing Finance

HOUSE BUILDING FINANCE CORPORATION

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۳ جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء

الاقرباء فاؤنڈیشن۔اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۴ اسلام آباد

فون ۴۴۴۲۶۸۶ فیکس ۰۵۱-۲۱۰۲۶۷۰

E-mail: alaqrebaislamabad@hotmail.com

بیرونِ ملک معاونینِ خصوصی

یورپ

بیرسٹر سلیم قریشی

برکلے چیمبر۔2۔اے، برکلے روڈ۔

لیٹن سٹون(Leytonstone)لندن۔

ای11 3 ڈی جی، فون 5582289(0208)

فیکس 5583849 (0208)

ای میل: qureshi@ss.life.co.uk

امریکہ

محمد اویس جعفری

218 نارتھ ایسٹ 175 سٹریٹ سیاٹل(Seattle)

واشنگٹن98155-3516 (یو۔ایس۔اے)

فون 361-8094 (206) دفتر 679-5321 (360)

فیکس 361-0414 (206)

ای میل jafreyomi@gmail.com

زرتعاون

فی شمارہ	۷۰ روپے
سالانہ	۳۵۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۶ ڈالر/ ۴ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ	۲۵ ڈالر/ ۱۵ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء
ناشر	سید ناصر الدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد

مندرجات

مضامین ومقالات

خاکے

حمد ونعت

غزلیات

رباعیات وقطعات

منظومات

نقد ونظر

مراسلات

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

تعلیم اور قومی تشخص۔۔۔ نظام و نصاب کے مسائل

خودآگہی اور خداآگہی کا واحد ذریعہ حصول علم ہے جو فرد اور جمیعت دونوں کی ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ عمل کثیر الجہت بھی ہے اور لامتناہی بھی۔ اول الذکر صورت میں سمت اور ترجیحات کا تعین، تہذیب و معاشرت اور عقائد و نظریات کے حوالے سے کیا جاتا ہے تاکہ فرد یا جمیعت کی شناخت ممکن ہو سکے چنانچہ اس تناظر میں اقوام و ملل جہاں اجتماعی تعلیم کے لئے حکمت عملی مرتب کرتے وقت جدید ترین علوم و معارف سے بہرہ مند رہنے کے لئے کوشاں رہتی ہیں، وہیں اپنی موجود و آئندہ نسلوں کو ایک توانا احساسِ تشخص عطا کرنے کی خاطر اپنی مخصوص روایات پر مبنی تاریخ کے مطالعہ کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ یہ اہتمام ملکی سطح پر صرف آزاد اقوام کے نصاب ترجیحات کا تو بالعموم حصہ ہوتا ہے لیکن وہ قومیں اور معاشرے جو حریتِ فکر و عمل کی نعمت سے محروم ہیں ایک اجنبی نظام کے تابع رہنے پر مجبور ہوتے ہیں چنانچہ جنوبی ایشیا کی اقوام کا عہدِ غلامی میکالے کے مسلط کردہ نظام و نصابِ تعلیم میں مقید رہا جس کے مقاصد محکوم اذہان کو غیر ملکی مفادات کے سانچوں میں ڈھالنا تھا البتہ سرکاری سطح سے قطع نظر نجی دائرہ کار میں مسلمانانِ برصغیر نے دینی و اخلاقی تعلیم کا جو ایک وسیع و عریض نظام قائم کیا اور اسلامی تاریخ کی تدریس کے ذریعہ اپنے نونہالوں کے اذہان و قلوب کی جس طرح تربیت کی اُس کے نتیجہ میں تسلیم کیا گیا کہ مسلمان برصغیر میں ایک باقاعدہ قوم کے اوصاف سے متصف ہیں اور اسی بنا پر بدترین اکثریتی سازشوں اور حکومتی رکاوٹوں کے باوجود پاکستان کا قیام عمل میں آیا

از کفِ دشمن گرفتم جام را　　　من شناسم گردشِ ایام را

نجی شعبہ میں فکر و عمل کا یہ انقلاب جس کے نتیجہ میں ایک نظریاتی مملکتِ خداداد کا قیام تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ بن گیا وہ ہمارے بزرگوں کی دانش و حکمت اور اخلاص و ایثار کا فیضان تھا چنانچہ آزادی کے فوراً بعد جن اولین بیانات و خطابات اور پیغامات میں حضرت قائداعظمؒ نے قوم کو مخاطب فرمایا اُن میں نومبر ۱۹۴۷ء میں منعقدہ پہلی تعلیمی کانفرنس کے نام پیغام کے درج ذیل الفاظ آج بھی اپنی

معنویت کا واسطہ دے دے کر قوم سے اخلاصِ عمل اور ملی حمیت و غیرت کے ملتجی نظر آتے ہیں:

''آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کی اہمیت اور صحیح طرز تعلیم کسی تاکیدِ مزید کے محتاج نہیں۔ ایک صدی سے زیادہ غیر ملکی حکمرانی کے دور میں ہمارے عوام کی تعلیم پر جو توجہ دی گئی وہ ناکافی تھی۔ ہم اگر حقیقی معنوں میں ٹھوس اور تیز رفتار ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ سے اخلاصِ نیت کے ساتھ نمٹنا ہوگا اور ایک ایسی حکمت عملی اور نظام مرتب کرنا ہوگا جو ہمارے لوگوں کے ذہنی و فطری میلانات کے مطابق ہو۔ ہماری تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو اور اُن تمام جدید وارتقائی عوامل سے مطابقت رکھتا ہو جو دنیا بھر میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ ہماری مملکت کے مستقبل کا انحصار اُس طرز تعلیم پر ہوگا جو ہم اپنے بچوں کو دیں گے اور پاکستان کے مستقبل کے شہریوں کی حیثیت سے جس طرح ہم انہیں پروان چڑھائیں گے۔''

قائداعظمؒ نے اپنے پیغام میں تین اہم نکات پر قوم کو متوجہ فرمایا:

(الف) تعلیمی نظام اور حکمتِ عملی اہل پاکستان کے ذہنی وفطری میلانات کے مطابق ہو۔

(ب) ہماری تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو۔

(ج) اُن تمام جدید وارتقائی عوامل سے مطابقت رکھتی ہو جو دنیا بھر میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔

چنانچہ جس کانفرنس کو یہ پیغام دیا گیا اُس کا بنیادی تصور بھی یہی تھا کہ آزادی کے بعد مملکت کے نظریاتی سیاق وسباق میں تعلیم سے متعلق نئی حکمتِ عملی کے تازہ خدوخال کیا ہوں جو عالمی تناظر میں قومی ضروریات اور امنگوں کی عملی تعبیر کہے جاسکیں' اس کے بعد ۱۹۹۸ء کی قومی تعلیمی کانفرنس (جس کی سفارشات ۲۰۱۰ء تک کی مدت کا احاطہ کرتی ہیں) تک گذرتے ہوئے مہ وسال کے دوران کم وبیش آٹھ یا نو ایسی دستاویزات مرتب کی گئیں جنہیں قومی حکمت عملی کا ترجمان تو کہا گیا لیکن نصف صدی سے بھی متجاوز قیمتی وقت کے ضیاع کے بعد جب ایسی ہی قومی سطح کی کانفرنس گذشتہ مئی ۲۰۰۶ء میں منعقد کی گئی تو جو منظر نامہ پیش نظر تھا وہ یہ تھا کہ تعلیم ہماری قومی ترجیحات میں پست سے پست تر ہو چکی تھی۔ اخلاقی، علمی اور نظریاتی اجزائے ترکیبی سے بسرعت محروم ہو کر تجارتی اور کاروباری حیثیت اختیار کر چکی تھی اور قوم

بدستور دوہرے نظامِ تعلیم کی سفا کی سے دوچار تھی جس نے طبقاتی رویّوں اور سوچ کو پروان چڑھا کر قوم کے مجموعی اتحاد ہی کو نہیں بلکہ حکمت و دانش کے قومی اثاثہ کو دو نیم کر کے رکھ دیا تھا' چنانچہ یہ تھا وہ منظر نامہ جو اربابِ حل و عقد اور ماہرینِ تعلیم کے لئے لمحہء فکریہ تھا اور سنگین چیلنج بھی۔

ہماری بدقسمتی کہ ہم من حیث القوم اُن اوصاف سے بوجوہ تہی دامن نظر آتے ہیں جو ایک غیور قوم کی پہچان ہوتے ہیں۔ ان وجوہ میں ہوسِ جاہ وزر اور اقوام مغرب کی نسبت ذہنی مرعوبیت اور احساسِ کمتری سرِفہرست ہیں جو نتیجہ ہیں تقریباً چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود بھی وہ نظام تعلیم نافذ نہ کر سکنے کا جس کی طرف حضرت قائداعظم نے واضح اشارہ فرمایا تھا کہ

''ہماری مملکت کے مستقبل کا انحصار اُس طرزِ تعلیم پر ہوگا جو ہم اپنے بچوں کو دیں گے''

آج کیفیت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی دینی و ملی اقدار سے ناآشنا اور مغربی اطوار زندگی کے گرویدہ ہیں' ہمارے دانش ور اور صاحبانِ فکر بے اعتمادی کا شکار ہیں اور ہر عہد میں مسند اقتدار پر متمکن طبقہ کبھی ذاتی مفادات کے گرداب سے باہر نہیں نکل سکا چنانچہ تازہ ترین تعلیمی پالیسی بھی اُن مقاصد کی تکمیل سے قاصر نظر آتی ہے جو قیام پاکستان کو جواز مہیا کرتے ہیں اور جو اقبال و قائد دونوں کی آرزوؤں کے مظہر تھے۔ خود سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں ایک کروڑ تیس لاکھ نونہالان قوم ایسے ہیں جو مکتب و مدرسہ کی صورت سے بھی آشنا نہیں جبکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دس سال سے متجاوز ناخواندہ افراد کی تعداد تقریباً پانچ کروڑ ہے جو ملکی آبادی کا ایک تہائی ہے۔

جدید علوم سے قوم کو آراستہ کرنا یقیناً ایک بہت بڑی ضرورت ہے اور بحیثیت بین الاقوامی ذریعہء اظہار انگریزی زبان کی اہمیت بھی مسلّم لیکن اپنی زبان' اپنی تاریخ و روایات اور سب سے بڑھ کر اپنے دینی و ملی اثاثہ کو پس پشت ڈال دینا جو ہماری قومی شناخت کے ضامن ہیں کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہماری اسی کج فہمی کے باعث آج نہ ملک کی جغرافیائی حدود وہ ہیں کہ جو تھیں اور نہ نظریاتی استحکام کیلئے وہ تڑپ زندہ ہے جس نے دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم مملکت اسلامیہ کا اضافہ کر کے تاریخ کا رُخ موڑ دیا تھا۔

آج سے بہتر تو ہم اُس وقت تھے جب ہندو اور انگریز دونوں ہمارے دینی و ملی تشخص کو مٹا دینے کے درپے تھے لیکن ہمارے بزرگوں نے اپنی تاریخ اور ماضی سے بیگانہ نہ ہونے دیا' مولانا محمد علی جوہرؔ نے جن پر ''مدرسہ و خانقاہ کی تہمت'' بھی نہ تھی اور جو علی گڑھ اور آکسفورڈ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنے دینی

وملی تشخص کے بھی نمائندہ ترجمان تھے۔ ۱۹۲۰ء میں مسلمان قوم کو ایسا نصاب تعلیم دیا تھا جسے آج بھی ہمارا رہبر ورہنما ہونا چاہئے۔ کہ یہی ہمارے ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے پیوستہ وہمکنار رکھ سکتا ہے۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی مولانا مرحوم کے مجوزہ نصاب تعلیم کی بہترین تجربہ گاہ ثابت ہوئی۔ جامعہ نے ایسی عظیم المرتبت اور جامع الصفات شخصیات پیدا کیں جنہیں دنیائے معارف میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا جوہرؔ کے مجوزہ نصابِ تعلیم کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

(۱) قرآن کریم سے بخوبی واقفیت بتدریس ترجمۃ القرآن (۲) عربی زبان کی تعلیم (۳) دینیات کی تعلیم جو غیر مسلموں کے لئے لازمی نہیں۔ (۴) ذریعہء تعلیم مادری زبان (۵) مغربی زبانیں (اختیاری) '(۶) دین ومذہب کی تعلیم کے علاوہ جغرافیہ' سیاست ومدنیات' طبیعات' کیمیا وحیاتیات' معاشیات' ریاضیات' منطق ونفسیات نیز علوم اسلامیہ' تاریخ' عمرانیات' فلسفہ' ادبیات اور قانون وغیرہ۔

سائنس کی تعلیم کی ضرورت واہمیت کے بارے میں مولانا مرحوم اپنی کتاب بعنوان ''قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام'' مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں رقمطراز ہیں:

> ''ہماری خواہش ہے اور اس امر کی سخت ضرورت بھی ہے کہ مسلمان سائنس میں نسبتاً زیادہ دلچسپی لیں اور اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تجویز ہے کہ منزلِ اول میں بھی سائنس کی تعلیم کا بحیثیت ایک لازمی مضمون کے انتظام کیا جائے تا کہ آئندہ علمی عمارت کے لئے یہ ایک بنیاد کا کام دے۔''

مولانا کے نصاب میں مجوزہ مدارج تعلیم درج ذیل ہیں:

(۱) مدتِ تعلیم ایک سے دو سال اور بچے کی عمر کے ساتویں سال تک' (۲) مدت تعلیم پانچ سال' عمر کے آٹھویں سال سے بارہویں سال کے اختتام تک ' (۳) مدت تعلیم پانچ سال عمر کے تیرہویں سال سے سترہویں سال تک' (۴) مُدتِ تعلیم تین سال یعنی عمر کے اٹھارویں سال سے بیسویں سال کے ختم تک (اعلیٰ تعلیم)۔

مولانا کی متذکرہ کتاب جو تقریباً نایاب ہو چکی تھی ۱۹۸۱ء میں صادقیہ پبلیکشنز ۴۲۱ پارک بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے دوبارہ طبع ہو چکی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا حصول حکومت کی دسترس سے باہر نہ ہوگا۔ مولانا کا یہ تصور تھا کہ:

''سائنس ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگی اور فلسفہ ہمارے بائیں ہاتھ میں اور
ہمارے سر پر ایک تاج ہوگا جس پر'لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ' لکھا ہوگا۔''

پاکستان کا قیام اسلامی تصورِ حیات کے رہینِ منت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا' ہمارا آئین اس حقیقت کی ضمانت ہے حضور اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق ''علم مسلمان کی میراث ہے'' تو پھر کیوں ہماری مقتدر ہستیاں اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ طرزِ عمل اپنائے ہوئے ہیں ہمارا دین جو ایک مکمل ضابطہء حیات ہے ہرگز جدید علوم سے اغماض پر راغب نہیں کرتا اور نہ کسی بھی زبان بشمول انگریزی سے عصبیت کا درس دیتا ہے لیکن ہمارا دین ہمیں بے شناخت و بے چہرہ بھی رکھنا نہیں چاہتا اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے نظام و نصاب تعلیم کو از اول تا آخر اپنے نظریہء حیات کی بنیاد فراہم کریں اور اعتدال و توازن کے اسلامی شعائر کو اپنائیں' مولانا جوہرؒ کے مجوزہ نصابِ تعلیم سے ضروری اضافہ و ترمیم کے ساتھ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور تعلیم کی پہلی منزل سے دین و اخلاقیات کا درس دے کر ہی ہم مستقبل کے غیور اور روشن خیال شہری پیدا کر سکتے ہیں' جس کے قائداعظمؒ آرزو مند تھے۔ اردو زبان کے بارے میں بھی ہمیں اپنا رویہ بہتر بنانا ہوگا کہ یہ بہر اعتبار ایک عالمی زبان کے معیار و منزلت سے ہمکنار ہو چکی ہے' یہی ہماری قومی زبان ہے اور اسی کو سرکاری زبان بھی ہونا چاہیے۔ اردو کا حق ہے کہ اُسے پاکستان میں ہر سطح پر لازمی زبان کا درجہ دیا جائے اور دیگر زبانوں بشمول انگریزی کو اختیاری حیثیت دی جائے کہ یہی اک طریقہ ہے قومی تشخص کی بازیافت کا۔

/ تو اگر خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

ڈاکٹر جمیل جالبی

سائنسی دور میں شاعری کا مستقبل

آندرے ژید سے کسی نے پوچھا کہ فرانسیسی زبان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا "افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے: وکٹر ہیوگو"۔ یہی سوال آندرے ژید کا جواب بتا کر دوسرے فرانسیسی ادیب و دانشور جان کاکتو سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ 'وکٹر ہیوگو ایک پاگل آدمی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ وہ خود ہی وکٹر ہیوگو ہے' وکٹر ہیوگو شاعر اور وکٹر ہیوگو انسان میں اتنا تفاوت تھا کہ اس کی شاعری کو پڑھ کر یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ وہی وکٹر ہیوگو ہے۔ اس میں دوسروں کو خوش کرنے یا معاشرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی وہ صلاحیت نہیں تھی جس سے ایک انسان دوسروں سے اچھے تعلقات قائم کر کے "شریفانہ" زندگی بسر کرتا ہے اور خبطی نہیں کہلاتا۔ شاعری فنون لطیفہ میں سب سے بڑی اور سب سے لطیف صنف ہے۔ اس میں واقعی کچھ کر کے دکھانا ایک ایسا مشکل اور نازک کام ہے کہ شاعر خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میر تقی میر کی "بے دماغی" بھی اسی کا نتیجہ تھی۔ آج سے دو ہزار سال پہلے ارسطو نے "بوطیقا" میں شاعروں کے بارے میں لکھا تھا کہ "شاعری یا تو زبردست صلاحیت رکھنے والے آدمی کا کام ہے یا ایسے شخص کا جو پورے طور پر "صحیح الدماغ" (نارمل) نہ ہو' اول الذکر بہت زیادہ حساس ہوتا ہے اور آخر الذکر عالم جذب میں ہوتا ہے"۔

اگر اس زاویہ نظر سے دنیا کے ادبیات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ عام طور پر ہر زبان کا بڑا شاعر کسی نہ کسی صورت میں عالم جذب میں رہتا ہے اور بحیثیت انسان وہ معاشرے کے اچھے "شریف" آدمیوں جیسا نہیں ہوتا۔ شاعری کے سلسلے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسان کے تخلیقی عمل کا سب سے سچا اور حقیقی اظہار شاعری میں ہوتا ہے۔ یہ ایسا تخلیقی عمل ہے جس میں خداوندی صفات شامل ہیں۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کا اظہار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کی شاعری میں ہوتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا کی بڑی اقوام پر نظر ڈالیے تو واضح طور پر نظر آئے گا کہ وہاں بڑے شاعر گم ہوتے جا رہے ہیں۔ اسباب پر غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ جدید معاشرہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے کاندھوں پر سوار ہو کر جس سمت میں سفر کر رہا ہے اس میں شاعری کا منصب وہ نہیں رہا جو اب تک رہا تھا۔ دوسری بات یہ سامنے آئی کہ اب تک شاعری کی زبان، محاورات، روزمرہ، استعارات، کنایات، تلمیحات اور رمزیات

پر مذہب کا گہرا اثر رہا ہے اور شاعر اپنے تخلیقی عمل کی داستان انہی الفاظ و کنایات کے ذریعے سناتا رہا ہے۔ اب جب کہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے زیر اثر ساری دنیا کا انسان بدل رہا ہے تو یہ زبان یہ محاورے، یہ روزمرہ، یہ تلمیحات و کنایات پوری طرح ساتھ نہیں دے رہے ہیں اور اسی لیے تخلیقی سطح پر شاعر جو کچھ دیکھ یا محسوس کر رہا ہے اس حقیقت کو پوری طرح دکھانے سے قاصر ہے۔ اظہار کی سطح پر آج کے حقیقی شاعر کا یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ شاعر ڈبلو ایچ آڈن (م۱۹۷۳ء) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ معاشرہ جو ایک زمانے میں مذہبی رہا ہو، اپنی روحانی موت کے بغیر سیکولر (غیر مذہبی) معاشرہ نہیں بن سکتا اور یہ ایسی سچی بات ہے کہ اس پر غور کرنا چاہیے۔ اس صدی میں سیاسی سطح پر عام طور پر ہوائیں سیکولرزم کی سمت میں چل رہی ہیں لیکن اندر سے باطن میں انسان اب بھی مذہبی رجحان کا حامل ہے اور وہ اپنا اظہار بھی اسی زبان اور روزمرہ و محاورہ کے ذریعہ سے کر رہا ہے جو اندر سے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں یا جنھوں نے کسی مذہبی عقیدے کی کوکھ سے براہ راست یا بالواسطہ جنم لیا ہے۔ اس تصادم سے آج کا انسان دو نیم ہو گیا ہے اور یہی ''دو نیمی'' ہمیں آج کے شاعر کے اندر اور اس کے اظہار میں مل رہی ہے۔ آج کے شاعر کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ اس غیر سیکولر ''مذہبی'' زبان کے ذریعے اظہار حقیقت کرتا ہے تو وہ اظہار ''کلیشے (CLICHE) بن جاتا ہے اور اگر وہ اس زبان و محاورہ کو ترک کرتا ہے تو وہ اپنی بات کا 'فنی سطح پر' پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا۔ اب اس بحث کا دوسرا پہلو دیکھیے۔ آج کے سائنسی دور مین شاعری کا منصب یا وظیفہ بھی بدل گیا ہے۔ پہلے شاعر کا کام جہاں جذبات کی تنظیم تھا' وہاں کائنات کی توجیہہ بھی اس کے منصب میں شامل تھی۔ اس طرح فکر اور جذبہ دونوں شاعری کے دائرہ میں شامل تھے غالب اور اقبال کی شاعری کا یہی دائرہ ہے۔ اس منصب کی وجہ سے وہ زندگی کے معانی بھی دریافت کرتا تھا اور معنی کو جذبات کا حصہ بھی بناتا تھا۔ آج یہ صورت حال بدل گئی ہے۔ اب معنی کی تلاش و دریافت کا منصب' شاعر کے دائرۂ عمل سے نکل کر سائنس دان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ اب ایک طرف تصور کائنات جادوئی یا مذہبی نہیں رہا بلکہ سائنٹفک ہو گیا ہے اور دوسری طرف انسان' معاشرے اور کائنات کے رشتے اور تعلق کے بارے مین حقائق کی دریافت سوشیولوجی، نفسیات، طبیعات اور متعلقہ علوم کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں اب شاعر کا منصب' اس سطح پر' بیانِ حقیقت (Statement of truth) نہیں رہا۔ آج کا شاعر دراصل ''حقیقت'' کا اظہار نہیں کرتا، جسے اس کے پیش رو ہزاروں سال سے کرتے آئے تھے۔ بلکہ اس کا یہ ''اظہار حقیقت''

کے بارے میں جذباتی بیان ہوتا ہے۔ایک ایسا بیان جو کسی مخصوص جذبے کی شدت میں شاعر کو اور ساتھ ہی قاری کو درست معلوم ہو۔انسانی احساس کی اب یہ سطح ہوگئی ہے۔اسی طرح ''فکر'' کی دنیا بھی اب شاعر کی دسترس میں نہیں رہی۔اب رہ گیا جذبہ اور اس کے اظہار کا مسئلہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جذبے کی دنیا تہذیبی سطح پر ایک مستحکم اور جمے جمائے معاشرے میں عام انسانی تعلقات کی دنیا ہے جو حسن و عشق اور احساسِ جمال سے لے کر خاندانی تعلقات اور کاروباری معاملات تک پھیلی ہوئی ہے۔مستحکم انسانی معاشرے میں تعلقات کی صورتیں مقرر و متعین ہوتی ہیں اور قائم و دائم رسم و رواج ان کے اظہار کے سانچوں کی تشکیل کرتے ہیں لیکن سائنسی معاشرے میں انسانی تعلقات اور رشتوں کا نظام بدل گیا ہے۔ سائنسی معاشروں میں وہ بنیادی اکائی یعنی خاندان کمزور سے کمزورتر ہو کر درہم برہم ہو رہا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جذبہ اپنے بنیادی مخرج سے کٹ کر خود زہر آلود ہو گیا ہے چنانچہ اب شاعری کے پاس مثبت جذبات بھی باقی نہیں رہے۔بودلیئر اپنے قاری کی ''اکتاہٹ اور بیزاری'' کا دکھڑا روتا ہے۔ڈی۔ایچ۔ لارنس اپنے قاری پر ''جبلی زندگی کی نفی'' کا الزام لگاتا ہے۔ٹی۔ایس ایلیٹ ان پر ''بے جان و مردہ'' ہو جانے کا الزام لگاتا ہے لیکن اپنے قاری پر الزام لگاتے وقت شعرائے کرام یہ بھول جاتے ہیں کہ منفی جذبات میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کے ذریعے ایک بار تو شاعری کی جاسکتی ہے بار بار نہیں کی جاسکتی۔میں نے ان سطور میں مغربی شعراء کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ سائنس کا عروج تو مغرب میں ہوا ہے سیٹلائٹ کے ذریعہ مغرب ہی اپنی بات ساری دنیا میں پھیلا رہا ہے۔فیکس،ای میل اور انٹرنیٹ کا نظام بھی اسی نے دریافت کیا ہے۔زہرہ، مشتری اور مریخ کا سفر بھی وہی کر رہا ہے۔اوزون کا حلیہ و توازن بھی مغرب نے بگاڑا ہے۔ہم اپلوں اور لکڑی کے ایندھن کے دھوئیں سے کائنات کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں سائنسی دریافت اور ٹیکنولوجی کی ترقی بھی مغرب ہی میں ہوئی اور ہو رہی ہے۔ہم تیسری دنیا والے تو مغرب کا تابع مہمل بن رہے ہیں۔ہمارے ہاں تو یہ اثرات ابھی محسوس ہونا شروع ہوئے ہیں۔جب یہ اثرات مغرب کی طرح ہماری ہاں بھی آجائیں گے تو ہمارا معاشرہ اور انسان بھی بدل جائے گا اور اس کے ساتھ ہماری فکر اور ہمارے جذبے بھی بدل جائیں گے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب مغرب میں تبدیلی کا یہ عمل پورا ہو جائے گا تو پھر انسان شاعری کی بنیاد کسی چیز پر قائم کرے گا؟ خلا میں سیارے پر بیٹھ کر سفر تو کیا جاسکے گا لیکن شاعری نہیں کی جاسکے گی۔

ڈاکٹر محمد معز الدین

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تنقید نگاری پر ایک نظر

دور حاضر میں تنقید نگاری کو باضابطہ ایک الگ صنف ادب کا درجہ حاصل ہے۔جس کے پرکھنے کے الگ الگ اصول واسلوب ہیں۔اردو کے کلاسکی ادب اور فن پاروں کو جانچنے کے لئے ہمیں مغربی اصول انتقاد سے نہیں، بلکہ مشرقی انداز نظر سے کام لینا چاہئے اردو ادب کے چند نقاد انگریزی،فرانسیسی، جرمنی وغیرہ کے ادیبوں سے متاثر ہو کر ان کے خوشہ چیں رہے،جن میں پروفیسر کلیم الدین احمد حسن عسکری،فراق گورکھپوری، احسن فاروقی خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ نمایاں ہیں۔کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی کا انداز تنقید نہایت سخت اور جارحانہ رہا ہے۔مثلاً احسن فاروقی کا یہ کہنا کہ

''اردو میں اس وقت نقادوں کی ایسی کثرت ہے جیسی برسات میں مینڈکوں کی ہوتی ہے ان کی تنقید کی بہترین تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ وہ علمی تنقید ہے وہ غلط علم اور غلط بیانی کے شکار ہیں''

اسی طرح ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی اور ترقی پسند ادب کی بحثیں شروع ہوئیں جو ایک حد تک اب فرسودہ ہوگئی ہیں۔ادب میں مقصدیت کا رجحان پیدا ہوا۔

درحقیقت اردو میں مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر تنقید کی بنیاد رکھی اور نیچرل شاعری کی اصطلاح سے مغربی تنقید وزاویہ نگاہ کی ترجمانی کی حالی مغربی ادب سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے مگر تنقید میں صداقت اور شعور تنقید کے ضامن تھے۔کلیم الدین احمد اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کہ ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یا اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر'' وہ مغربی ادب وتنقید سے حد درجہ متاثر نظر آتے ہیں۔اردو غزل ان کے نزدیک نیم وحشیانہ صنف شاعری ہے ان کا نقطۂ نظر انتہا پسندانہ اور جارحانہ ہے تاہم وہ حالی کو اردو تنقید کے بانی قرار دیتے ہوئے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں'' حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غوروفکر کیا،شعروشاعری کی ماہیت پر روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔اپنے زمانے ،اپنے

ماحول اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔مقدمۂ شعر و شاعری گویا پہلی اور اہم ترین ناقدانہ تصنیف ہے۔(اردو تنقید پر ایک نظر' ص ۸۷)

اب میں اس مختصر تمہید کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتا ہوں۔ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک بلند پایہ نقاد اور مستند محقق کے علاوہ ایک منفرد شاعر ممتاز افسانہ نگار تھے' اردو تنقید نگاروں میں ڈاکٹر شادانی کا جو مرتبہ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ان کے تنقیدی مضامین اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ان کے انتقادی مضامین سے اردو ادب میں ایک نئی راہ نکلتی ہے جو نئے ناقدین ادب کو ان کی منزل کا پتہ دیتی ہے اور شائقین ادب کے لئے کسی فن پارہ کو پرکھنے کا صحیح پیمانہ مہیا کرتی ہے۔ان کا زاویہ نظر نیا اور منفرد بھی ہے اور جرأت آموز بھی میرے نزدیک سب سے بڑی چیز جو نئے نقادوں کو انہوں نے دی ہے وہ دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہنے کا حوصلہ ہے۔وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے نہائت غور و فکر کے بعد جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ استدلال اور جامع ہوتا ہے کہ مخالفین کو بھی ان کی رائے تسلیم کرتے ہی بنتی ہے۔ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں کہ

''جو منطقی ماحول وہ اپنے دلائل کو عطا کرتے ہیں اس دائرے سے باہر نکلنا آسان نہیں''

(مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۳۸۵)

قوت استدلال قدرت کا خاص عطیہ ہے۔ان کو دلائل و توجیہہ کا وہ فن آتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔جواز و دلیل کے وہ نئے اور باریک پہلو نکالتے ہیں کہ ان کا ہم خیال بنے بغیر چارہ نہیں اپنی علمی استعداد سے انہیں اس میں بڑی مدد ملتی ہے کیونکہ موضوع پر اگر پوری گرفت نہ ہو تو محض استدلال سے کام نہیں چلتا۔ان کی تنقید غیر جانبدار ہونے کے علاوہ حد درجہ بیباک ہے تنقید نگاری کے لئے جانبداری مصلحت بینی' جماعت پرستی اور رُو رعایت زہر قاتل ہیں۔ڈاکٹر شادانی صاف گو ہیں غلطی خواہ کسی کی ہو وہ معاف نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں کہ ''غلطی بہر حال غلطی ہے خواہ وہ کسی سے سرزد ہو' اور اس سے بڑھ کر نادانی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اغلاط گزشتگان کو صحت زبان کا معیار ٹھہرایا جائے۔''

غالب و حالی سے لے کر نیاز و جوش تک کو انہوں نے نہیں بخشا جوش کی لسانی غلطیوں اور نیاز کی کمزوریوں کو بھی نہیں چھوڑا۔حسرت، اصغر، جگر اور فانی جس سے بھی جہاں اور جب چوک ہوئی ہے

انہوں نے برملا ٹوکا ؎ ''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں''
واضح رہے کہ اس سے ہرگز ان کا مقصد کسی کی تضحیک نہیں جیسا کہ ان پر الزام ہے۔ کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا دکھانا تنقید نگار کا فرض ہے۔ مولانا رضا علی وحشت مرحوم نے ان کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''اساتذہ کی اغلاط کی جو مثالیں آپ نے دی ہیں ان کو کوئی صحیح ثابت نہیں کر سکتا'' (مطبوعہ مہر نیمروز وحشت نمبر)

انہوں نے گذشتگان کے علاوہ اپنے دور کے بہت سے بُت توڑے اس لئے کچھ لوگ ان کے مخالف ہو گئے اور ان کی تنقید کو تنقیص کے نام سے موسوم کیا۔ صحیح علمی ذوق رکھنے والا شخص ہرگز ان کے تنقیدی مضامین کو تنقیص نہیں کہہ سکتا۔ ''کسوٹی'' ''سند'' ''الفاظ و معانی کا رشتہ'' اور ''ریختی'' وغیرہ ان کے ایسے عالمانہ مضامین ہیں جن کی افادیت اور اوریجنلٹی سے کون انکار کر سکتا ہے ہمارے تنقیدی سرمایہ کے یہ انمول جواہر ہیں۔ ان کے یہ مضامین تنقیصی نہیں بلکہ تخلیقی کہے جا سکتے ہیں۔

کچھ لوگ حافظ کی رندی اور میر کے خاص رنگ پر معترض رہے محض اس لئے کہ ان کی عقیدت مندی کو ٹھیس لگتی تھی۔ ان سے کوئی یہ پوچھے کہ حافظ و میر کا بیباک قلم جب ایسے اشعار لکھنے پر نہ رُک سکا تو احتساب کرنے والے کے قلم پر پابندی لگانا کہاں کا انصاف ہے۔ حافظ و میر تو خیر جیسے تھے تھے ہی تصوف اور اخلاق کے معلم رومی و سعدی کے یہاں ایسے فحش اشعار اور شرمناک حکائتیں ہیں کہ پڑھ کر خود انسان جھینپ سا جاتا ہے۔ ہمارے استاد نے گلستان کا باب پنجم یہ کہہ کر پڑھانا چھوڑ دیا تھا کہ جوان ہو کر تم خود پڑھ لو گے۔ بات یہ ہے کہ اُس زمانہ کا ماحول ہی ایسا تھا کہ یہ چیزیں اتنی معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اب اگر اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس میں بدکنے کی کیا بات ہے یہ خیال بھی غلط ہے کہ اساتذہ نے جو کچھ کہا ہے اسے ڈاکٹر شادانی لایعنی اور خرافات بتاتے ہیں یہ بات ان کے انتقادی مضامین کے مزاج سے ناواقفیت پر دلالت کرتی ہے وہ کسی کی تنقیص یا تضحیک نہیں چاہتے تھے بلکہ اساتذہ یا بزرگوں کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ان کی کمزوریوں سے خود بھی بچنا چاہا اور دوسروں کو بھی ان کی اندھی تقلید سے روکتے رہے۔ ملاحظہ ہو ان کی یہ عبارت ''اساتذہ کی بزرگی مسلّم ان کی زبان ہمارے لئے سرِ عشق اور ان کا قول برہان قاطع کا حکم رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ بھی ہماری اور آپ کی طرح انسان ہیں اور ''نسیان و خطا'' سے مبرا نہیں۔'' (تحقیقات صفحہ ۹۲)

ان پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ تصویر کا محض ایک ہی رخ دکھاتے ہیں جو داغدار ہے۔

دراصل ایسا نہیں جن لوگوں نے ان اساتذہ کی یا شعراء کی تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھا دکھا کر ان کے صحیح خدوخال کا اندازہ نہ لگنے دیا تھا ڈاکٹر شادانی نے دوسرے رخ کی بھی نقاب کشائی کی ہے تاکہ دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں، ایک رخ تو بار بار دکھایا جاچکا تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی دوسرا رخ بھی دکھاتا یہ کام ڈاکٹر شادانی جیسا نڈر نقاد ہی کرسکتا تھا۔

مجھے اس بات سے بھی اتفاق نہیں کہ وہ عام عقائد کے خلاف بات کہہ کر ہنگامہ برپا کرنا چاہتے تھے جس سے اپنی شہرت مقصود تھی۔ بات یہ ہے کہ شاعری ہو یا تنقید نگاری عام روش سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے۔ عامیانہ اور فرسودہ خیالات سے اجتناب کرتے اور ایسی بات کہنی چاہتے جس پر کسی کا ذہن نہ گیا ہو۔ یہی ندرت انکی انفرادیت کا سبب ہے۔ نئی اور نوکھی بات پر لوگوں کا چونکنا بھی فطری ہے ''مہر صاحب کا ایک خاص رنگ''، ''ایران کی امرد پرستی کا اثر اردو شاعری پر'' فارسی غزل اور جفائے محبوب''، ''خواجہ حافظ اور شراب وشاہد''، ''جیسے عنوانات کا ذہن میں آنا ہی ان کی انفرادیت پر دال ہے۔

ان کا مزاج چونکہ مشرقی تھا لہٰذا ان کی تنقید کی زبان میں بھی مشرقی رچاؤ ہے۔ وہ موجودہ انگریزی اصطلاحوں یا بندھے ٹکے، گھسے پٹے مقررہ تنقیدی فقروں سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے یہاں تنقید کے اذعانی اصول نہیں۔ جن کی دور حاضر کے اکثر نقادوں کے یہاں بہتاب ہے۔ میرے استفسار پر ایک بار انھوں نے کہا تھا کہ ''مضامین لکھتے وقت جس بات کا میں سب سے زیادہ خیال رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے خیال اور نقطۂ نظر کو دوسروں کو اچھی طرح سمجھا سکوں''۔ چنانچہ مشکل سے مشکل موضوع پر بھی جب وہ قلم اٹھاتے تو اس سادگی اور صفائی سے سمجھا دیتے کہ ان کے مفہوم اور نقطۂ نظر کو سمجھنے میں ذرا بھی الجھن نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ان کے اسی مضمون ''الفاظ ومعنی کا رشتہ'' کو لیجئے موضوع کے اعتبار سے یہ جتنا پیچیدہ ہے ضبطِ تحریر میں آکر یہ اتنا ہی آسان ہوگیا ہے۔ انداز بیاں کا یہ کرشمہ ہے ان کی سادہ اور بے تکلف نثر کا بھی یہ اعجاز ہے۔ ''مواد ہیئت اور اسلوب'' بھی ان کے انتقادی انداز بیان کی عمدہ مثال ہے۔

ہاں کہیں کہیں لب ولہجہ کی درشتگی سے ان کے اور قارئین کے درمیان مفاہمت کی گنجائش کم ہو جاتی ہے لہجہ کی تلخی اور تندی کے اعتبار سے ڈاکٹر شادانی مجھے پروفیسر کلیم الدین احمد سے کہیں کہیں قریب معلوم ہوتے ہیں اپنی بلندو بالا تنقید کے باوجود کلیم الدین احمد قارئین کو اپنا ہمنوا بنانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے ڈاکٹر شادانی بھی اگر بپھرا ہوا انداز بیان نہ رکھتے تو قارئین پر ناخوشگوار اثر نہ ہوتا۔

دلکش اشعار کہنے اور افسانوں میں حد درجہ شیریں زبان لکھنے کے باوجود تنقید میں اچانک ان کا لہجہ بدل جاتا ہے اور بقول ایک ناقد جب کسی شاعر یا ادیب کی ذہنی تخلیقات کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو یک بیک ان کے تیور بدل جاتے ہیں۔ ان کا نغمہ بار قلم تلوار کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور ان کی رومان پسند طبیعت انگارے اگلنے لگتی ہے۔ اور یہی چیز اس مخالفت کا سبب ہے جو ڈاکٹر صاحب نے سارے زمانے سے مول لے رکھی ہے۔ (مشرقی بنگال میں اردو پروفیسر اقبال عظیم، ص ۲۵۳)

ان کا طنز زہر میں ڈوبا ہوتا ہے لیکن طنز کے ساتھ لطیف مزاح اور زبان کی دلآویزی سے پڑھنے والے کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ طنز و مزاح اور شگفتہ انداز بیان کی ایک مثال ملاحظہ ہو "ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک عرب ہندوستان آیا۔ اتفاق سے محرم کے زمانے میں اسے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ جدھر جاتا ہے گریہ و ماتم جدھر جاتا ہے شیون و شین حیران ہو کر پوچھا کہ کون مر گیا۔ جس کے لئے سارا شہر عزا خانہ بنا ہوا ہے۔ جواب ملا کہ اے نادان تجھے معلوم نہیں کہ یہ ماتم حسین ہے۔ عرب نے بڑے تعجب سے کہا اچھا یہاں اب خبر آئی ہے۔ حسین کی وفات کو تو تیرہ سو برس گزر رے" وہ بیچارہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس شخص کی وفات کو تیرہ سو برس گزر چکے۔ آج اس کی مجلس عزا کیوں برپا ہے۔ لہٰذا اس نے یہی قیاس کیا کہ غالباً ہندوستان کے لوگ واقعہ کربلا سے اب تک بے خبر تھے اب خبر ہوئی ہے اور مصروف ماتم ہیں اردو شاعری میں پیر مغاں اور مغبچوں کا ذکر بھی ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا اس عرب کے نزدیک امام حسینؓ کی وفات کے تیرہ سو برس بعد لکھنؤ میں ان کا ماتم تھا۔ اس لئے کہ قبول اسلام کے بعد خود ایران میں بھی پیر مغاں اور مغبچوں کا وجود برائے نام رہ گیا تھا۔ چہ جائیکہ ہندوستاں جہاں یہ گروہ نہ کبھی تھا نہ آج ہے"۔ (تحقیقات صفحہ ۱۸)

ان کے تنقیدی مضامین میں علمی معلومات کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے ادبی اور علمی مضامین میں اتنے حوالے دیتے اور دلچسپ واقعات بتاتے جاتے ہیں کہ مضامین پڑھکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آج کتنی اہم اور مفید باتیں معلوم ہو گئیں اور ذہن کے کتنے گوشے بیدار ہو گئے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں لہٰذا اس بحث کو ڈاکٹر اعجاز حسین ہی کی رائے پر ختم کرتا ہوں۔ "جس موضوع یا مصنف پر وہ رائے زنی کرتے ہیں 'نہایت بے باک ہو کر اظہار خیال کرتے ہیں خصوصی بات یہ ہے کہ لہجہ یا انداز بیان میں ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ ساری فضا نقد و تبصرہ کی آغوش میں جھومتی رہتی ہے" (مختصر تاریخ اردو، ص ۳۸۰)

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

معاشرے کی تشکیلِ نو میں ادب کا حصّہ

ادب اور معاشرے کا محکم رشتہ ایک ایسی صداقت ہے، جس سے انکار ایک غیر ادبی اور غیر معاشرتی جسارت ہوگا۔ یہ رشتہ ایک ذمہ داری بھی ہے جو ادب کو اپنے معاشرے کی تشکیل نو کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ جس طرح ایک پودا اپنے پھولوں کے رنگ و خوشبو سے، اپنے شیریں اور رسیلے پھلوں کے ذائقے سے اور اپنی گھنی پتیوں اور لانبی شاخوں کے نرم و خنک سائے سے اپنی مٹی، آب و ہوا اور نشو و نمائی عوامل کا قرض ادا کرتا ہے، بالکل اسی طرح ادب اپنے معاشرتی احوال و ظروف میں پل بڑھ کر اپنے معاشرے کی کچھ ذمہ داریاں ادا کرتا ہے بلکہ یہ اس کا مقصد و منصب ہونا چاہیئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے کی پیش رفت میں اور زیبائی و چہرہ آرائی میں جہاں دوسرے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں وہاں ادب نے بھی یہ حق حسب توفیق ادا کیا ہے۔

برصغیر میں جب صدیوں کی عظمت و جلالت کے بعد ایک قوم زوال و انحطاط کی زد میں آگئی اور اس کا شیرازہ بکھرا تو ادب نے اس کے ذہن و فکر کا رخ موڑا۔ اس کے پراگندہ حواس کو مجتمع کیا۔ اس کی ہمت بندھائی۔ اس ملت گم گشتہ کی باز آفرینی اور خود شناسی کے عمل میں ہم ادب کے فعال کردار سے انکار نہیں کر سکتے۔ پھر جب قومی تشخص بحال ہوا اور ہم اپنی شناخت کی منزل میں آئے اور ہم نے تحریک آزادی کا آغاز کیا تو اس عظیم تاریخی جدوجہد کے پس منظر میں وہ روشنی نظر آتی ہے جو ادیبوں کے ذہن و قلم سے طلوع ہوئی اور اس دور رس روشنی میں ایک غیرت مند اور بلند عزم کارواں نے حریت و آزادی کا سفر طے کیا اور منزل مقصود پر پہنچ کر آسودہ ہوا، یہ درست ہے کہ ہم ان مددگار عوامل سے قطع نظر نہیں کر سکتے جنہوں نے ہمیں اغیار کے کلچر میں جذب نہیں ہونے دیا اور طویل دور غلامی میں یہ احساس ہمارے ذہن و قلب کا حصہ رہا کہ ہماری فکر، ہماری تہذیب، ہماری تاریخ اور ہمارا طرز حیات ہماری ہم باش قوموں سے یکسر مختلف ہے اور ہم اپنے امتیاز سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے لیکن جذبے اور فکر کی سطح پر ادب نے ہمارے اس ملی تشخص کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ فروغ دیا اور اس طرح ادب تشکیل نو کا فریضہ انجام دیتا

رہا، یوں تو تمام بنی نوع انسانی وسیع معنوں میں ایک معاشرہ ہے، لیکن وفکار ومعتقدات، تاریخ وتہذیب، روایت کا تسلسل اور زندگی بسر کرنے کا ایک مخصوص تصور وعمل ایک خاص معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اور یہیں سے اس میں اور دوسرے معاشروں میں خط امتیاز کھنچ جاتا ہے۔ گویا نظریہ حیات کی تعیین سے معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے اس اعتبار سے ہمارا معاشرہ اپنے مخصوص مزاج اور خصائص کی بنا پر ایک الگ تھلگ اور ممتاز ہیئت اجتماعیہ ہے، جس کے مطالبات ومقتضیات اس کے نظریہ حیات کے تابع ہیں!

تشکیل نو سے مراد معاشرے کی تہذیب وتزئین بھی ہے اور تطہیر وتقدیس بھی اس سے سیدھی سادی مراد یہ بھی ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے ادب نے کس حد تک اپنے معاشرے کی چہرہ آرائی، زیبائی اور باطنی حسن افزائی میں حصہ لیا ہے یعنی آج کا موضوع ہمیں خود احتسابی کی دعوت بھی دیتا ہے اور اپنے جائزے کے بعد ہمیں آئندہ کے لئے کچھ واضح اور روشن خطوط متعین کرنے کی ضرورت کا احساس بھی دلاتا ہے۔

ہمارے یہاں پچیس تیس سال کے عرصے میں ادب جامد نہیں رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی اس میں تیز رفتاری آئی کبھی سست روی، خصوصاً جب کوئی جذباتی محرک پیدا ہوا تو ادب کی تخلیقات میں ہنگامی طور پر بہت اضافہ ہوا۔ پاکستان بنا تو ادیبوں اور شاعروں نے اپنے تجربات وحوادث کو خون دل میں انگلیاں ڈبو کر تحریر کیا۔ ناول، افسانے اور نظمیں بکثرت وجود میں آئیں اسی طرح جب قوم ایک دوبار آشوب جنگ سے گزری تو بہت کچھ لکھا گیا اور جو کچھ لکھا گیا اس نے معاشرے کے دل کو گداز بھی کیا، جذبے کو تحریک بھی دی ذہن کو سوچ بھی عطا کی اور ان اعلیٰ اوصاف کی تخلیق بھی کی جو ایک معاشرے کی قدر بلند کرتے ہیں اور اسے جینے کے آداب سکھاتے ہیں، لیکن جب کوئی جذباتی محرک ختم ہوا تو گویا جوش تخلیق بھی سرد پڑ گیا اور معاشرے کی کردار سازی اور وصف آفرینی کے عمل میں ادب کا قدم پیچھے رہ گیا یہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جذباتی تحریک کے لئے خارجی سطح پر ضرور کوئی ایسا انوکھا منظر ابھرتے رہنا چاہیے جو ادیب کے ذہن ودل کا حصہ بن کر اس کے قلم کو جنبش میں لائے، جبکہ چشم بینا، دل دانا اور ذوق توانا کے لئے ہمہ وقت تحریکات کے در باز ہیں ہم عام طور پر بہت سے مناظر ومشاہدات کو معمولی اور کمتر سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ بڑے ادب کی تخلیق کے لئے بڑے موضوعات درکار ہیں حالانکہ ہر ذرے میں آفتاب وماہتاب کا مشاہدہ ہوسکتا ہے اور پھر ادیب کے باطن میں جو ایک

نہاں خانۂ عجائبات ہے اس کا انکشاف وظہور خود جنبش قلم کا سامان ہے اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ادیب اپنی ذات کے خول میں داخل ہوکر معاشرے سے اتنا کٹ جائے کہ اس کے اور اس کے معاشرے کے درمیان کوئی ذہنی نقطہ اتصال باقی نہ رہے، بہر حال اس کے باطنی انکشاف اور اس کے خارجی احوال وکیفیات میں ایک رابطہ ضروری ہے ورنہ اس کی تخلیقات کی روشنی سے اذہان وقلوب کا کوئی گوشہ منور نہ ہو سکے گا۔

گذشتہ برسوں کی تاریخ اور اپنے معاشرتی احوال کے نشیب وفراز اور ایسی صورت حال نے جس میں استحکام اور تیقن کی نسبت انتشار اور بے یقینی کا پہلو زیادہ نمایاں رہا، ہمارے بعض ادبا کے جذبہ تخلیق اور جوش تخلیق کو خاصا متاثر کیا ایک خارجی انتشار نے خود انہیں باطنی انتشار، بے دلی اور بد دلی میں مبتلا کر دیا اور انہوں نے خود حفاظتی کے خیال سے اپنی ذات کے خول میں پناہ لینے کو ترجیح دی۔ اس طرح وہ معاشرے کے متغیر اور منتشر احوال پر اثر انداز نہ ہو سکے اور معاشرتی تنظیم میں حصہ نہ لے سکے، یا اگر انہوں نے لکھا تو اس انتشار کی عکاسی ہی کی اور افراد کے ذہن میں یاسیت، افسردگی، بے دلی اور اضطراب کی تخم کاری ہی کرتے رہے، ضروری تھا کہ ذہنوں کے رخ موڑتے اور دلوں کو حوصلہ بخشنے میں وہ رجائی نقطۂ نظر کو اپناتے اور اپنے ذہن وقلم سے یاسیت کے خلاف جہاد کرتے۔۔ اگرچہ بعض ادبا کے یہاں ایک اثباتی اور امید افزا نقطۂ نظر قائم رہا لیکن یہ انفرادی سطح پر تھا جو زیادہ موثر ثابت نہ ہو سکا اور معاشرے کے اجتماعی احوال میں کوئی مثبت تبدیلی نہ ہو سکی۔

ہمارا وطن ایک خاص نظریہ حیات کی اساس پر وجود میں آیا تھا، ہمارے ادیبوں نے بہت کچھ لکھا بہت تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ لکھا۔ موضوعات اور اسالیب اور افکار وخیالات کی بوقلمونی کے ساتھ لکھا لیکن کیا ہم تمام تر تخلیقات کو اپنے نظریۂ حیات کے رشتے میں پرو سکتے ہیں، کیا ساری تحریریں ہمارے مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ مربوط ہیں، کیا ان سب میں فنی اور معنوی جمالیات کے ساتھ ساتھ ادب کے اس مقصد ومنصب کی جھلک ہے جو ہمارے نظریئے کا تقاضا ہونا چاہیئے۔ کیا ہماری تہذیبی اقدار، ہمارا ملی تشخص، ہماری تاریخی عظمت اور ہمارا ملی نصب العین ہمارے آئینہ ادب میں اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔

میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ ایک نظریاتی مملکت میں ذہن اور قلم کو بے لگام نہیں چھوڑا جا سکتا اور ایسی تخلیقات کو وجود میں آنا نہیں چاہئے جو اس نظریے سے متصادم ہوں، ورنہ ایسا ادب معاشرے کو کس

بنیاد پر مرتب کرے گا اور اس کے انتشارات جس کے بہت سے اسباب وعوامل ہو سکتے ہیں، کس طرح تنظیم، یک جہتی اور ایک خاص مرکزیت سے وابستہ ہو سکیں گے۔

اگر چہ تمام تر نہ سہی لیکن خاصا کچھ لکھا گیا ہے جس سے ہمارے نظریہ حیات کی روشنی پھوٹتی ہے، خاص طور پر چند سال سے حمد ونعت اور مناقب ومراثی کی شکل میں ایک گراں قدر سرمایہ فراہم ہوا ہے۔ خدا سے رابطے کی جانب مراجعت رسول پاک ﷺ کی تعلیمات وسیرت سے استفادہ اور بزرگان اسلام کے اخلاق عالیہ اور فضائل کے اتباع کی ترغیب اور اس تمام ادبی عمل کے ذریعے معاشرے کی ذہنی اور فکری تشکیل نو کی شعوری کوشش نے بہت حد تک ہمارے نظریہ حیات کو ابلاغ وفروغ دیا ہے۔ اس سلسلے میں محض تقلیدی اور رسمی اسالیب ومضامین نہیں برتے گئے بلکہ اس عقلی اور سائنسی دور کے مطالبات کو نظر میں رکھتے ہوئے اعتقادی رویئے کی بجائے حکیمانہ، فلسفیانہ اور فکر انگیز روش اختیار کی گئی اور اس طرح اس دینی واخلاقی ادب کو ایک دعوت بنا کر پیش کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی اور فکری انتشار کے لمحوں میں ایسے ادب کی تخلیق نے جمعیت خاطر کی فضا کو بحال کیا اور قائم رکھا ہے اور افراد معاشرہ کے سامنے ان عظیم شخصیات کو اسوۂ عمل بنا کر لایا گیا جو اپنے اخلاقی فضائل کے اعتبار سے ہر عہد میں انسانیت کی رہبری کرتے ہیں، مختصر یہ کہ اس ادب کی تخلیق نے ہمارے مثبت اور جاندار نظریہ حیات کے ابلاغ کا فریضہ انجام دیا ہے۔

ہمارے نثری ادب نے بھی بالخصوص ناول اور افسانے میں ہمارے معاشرتی دکھ سکھ اور مسائل وحوادث کو پیش کیا ہے۔ فرد کے ذہن وجذبات اور اجتماعی زندگی کے احوال وکوائف پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اگر چہ ادب کی ہر تحریر کے پس منظر میں ادیب کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے اور وہ ہے، لیکن اس نقطۂ نظر نے عموماً ہمارے ملی تشخص کو ابھارنے اور ہمارے نظریہء حیات اور ہماری مخصوص تہذیبی وتاریخی روایات کو اجاگر کرنے اور معاشرتی ذہن کا حصہ بنانے کا بھر پور کردار اب تک ادا نہیں کیا۔ غور کرنا چاہیے کہ کون سے باطنی یا خارجی اسباب وعوامل ہو سکتے ہیں جو رکاوٹ بنے ہوئے ہیں فنکار کے دل کا خلوص، باطنی صداقت، تخلیق کی بھر پور صلاحیت اور اپنے ضمیر سے کومٹ منٹ ہونے کی صورت میں مثبت نتائج حاصل کیوں نہیں ہو رہے ہیں؟

معاشرے کی تشکیل نو کے سلسلے میں ادب کے خطوط کیا ہونے چاہئیں۔ مختصر ترین لفظوں میں

کہا جا سکتا ہے کہ فنی اور معنوی جمالیات کے دائرے میں رہ کر خیر کا فروغ اور شر کا استیصال۔ بعض اوقات ہمارا ادب بدی کے خلاف تو صف آرا ہو جاتا ہے لیکن اقدار خیر کی تحسین نہیں کرتا۔

ہم یہ تو منہ بھر کر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص مرتشی ہے اور اس بنا پر یہ حکم بھی صادر کر دیتے ہیں کہ آوے کا آوا بگڑ ہوا ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ فلاں شخص نے اتنے لاکھ کی رشوت پر لات مار دی، بدی کی قدر شکنی کے ساتھ ساتھ نیکی کی قدر شناسی بھی ضروری ہے۔ بعض حالتوں میں ہم لوگ بے یقینی اور بیدلی کے اس مقام مہلک پر ہوتے ہیں کہ ہم صرف ظلمتوں کا ادراک و عرفان کرنا چاہتے ہیں اور اگر ہمیں نیکی کی کوئی مضمحل سی کرن نظر آتی ہے تو ہم اس کے وجود کا انکار کر دیتے ہیں یا کہہ دیتے ہیں کہ ظلمتیں اس شعاع ناتواں کو نگل جائیں گی۔ معاشرے کی تشکیل نو اس مریضانہ ذہنیت اور اس جانکاہ ادبی رویے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ بحث اب فرسودہ بھی ہو چکی ہے اور فضول بھی ہے کہ ادب عکاس ہوتا ہے یا ترجمان لیکن وہ نقاد اور مبصر نہیں ہوتا اور رہنما تو بالکل نہیں ہو سکتا، رہنمائی تو مصلحین اور قائدین دین و اخلاق کا کام ہے۔ ادب کا کام تو محض حال کی عکس بندی کرنا اور مستقبل کے خواب دیکھنا ہے۔

ایک نظریاتی مملکت میں یہ تصورات نہایت گمراہ کن ہیں۔ ادب اپنے دوائر میں رہتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے اور اسلوب اور فنی محاسن کے ساتھ رہبری کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اسے دینا چاہئے، یہ غلط ہے کہ وہ صرف مسائل کی طرف اشارے کر دے۔ رمز یا اشاریت یا علامت کے پردے میں نشان دہی کر دے۔ آخر وہ مسائل کو اپنے ادبی لہجے میں حل کیوں نہ کرے جب اقبال کہتے ہیں۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اگلے زمانے کے خواب

تو وہ خواب دیکھتے ہیں، جب وہ کہتے ہیں:

عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

تو وہ خواب کی ایک تعبیر متعین کرتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں:

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

تو گویا ادیب و شاعر اقبال، مفکر اقبال، رہنما اقبال بن جاتے ہیں۔ وہ تعبیر کے مجسم ہونے کی عملی تدبیر بتاتے ہیں اور ایک مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں۔ معاشرتی تشکیل نو میں ادب کو اب یہی فعال کردار پیش کرنے کی ضرورت ہے ایک نظریاتی معاشرے میں جیسا کہ ہمارا ہے، بدی کی ہر شکل کا

استیصال ہونا چاہیے اور خیر کی ہر قدر کو بحال اور مستحکم ہونا چاہئے۔ ہماری نثر اپنی بہت سی اصناف کے ذریعے جن کا ابلاغ عوام تک بہ آسانی ہو جاتا ہے اور ناخواندہ یا نیم خواندہ افراد بھی کسی نثر پارے خصوصاً کہانی کی کسی بھی شکل کے مفہوم تک ذہنی رسائی حاصل کر سکتے ہیں، یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ خیر میں خدا کی حاکمیت، قادریت، رزاقی اور مختاری کے تصورات کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت وشفقت اور بندوں کے ساتھ اس کے رحم وکرم کے تعلق کا اظہار اور خصوصاً اس تصور کا ابلاغ کہ اس کی عبودیت واطاعت میں عظمت بشری کا راز پوشیدہ ہے، رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اتباع کامل کی دعوت، اکابر اسلام کی سیرت اور کارناموں کے نقوش کو اجاگر کرتے کا عمل اور اخلاق فاضلہ کی تلقین جن میں حیا وغیرت، شجاعت وشہادت، ہمدردی ومحبت، حسن سلوک وخوش معاملگی، دیانت وامانت، ادائے حقوق وفرائض، حب ملی، انسان دوستی، عدل وامن پسندی کی صفات واضح ہوں، ان کی ترسیل وتبلیغ اور بدی کی بیخ کنی، جس میں ظلم، دروغ گوئی، منافقت، حرص وطمع، اسراف، حسد تکبر، فحاشی وتعیش پسندی معاشرے کی نمایاں اخلاقی بیماریاں ہیں۔

میں یہاں الگ حیثیت میں منافقت یعنی ظاہر وباطن کے تضاد کا ذکر کروں گا یہ روگ ہماری حیات اخلاقی کو اس طرح کھا گیا ہے جیسے لکڑی کو دیمک ہم اہل معاشرہ جو کچھ ہمارا مافی الضمیر ہوتا ہے وہ ہمارے لب ودہن پر نہیں آتا۔۔ پھر یہ کہ ہمارے قول اور ہمارے عمل میں یکسانیت نہیں ہوتی۔

کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔۔۔ شخصیت کی یہ دورنگی، فرد کا یہ دوہراپن ہمارا سب سے بڑا، معاشرتی المیہ ہے اگر ادب صرف یہی کارنامہ انجام دے دے کہ وہ معاشرے سے دورنگی کا یہ رنگ دھوڈالے اور افراد کے فکر وعمل اور ظاہر وباطن میں صداقت کا رشتہ استوار ہو جائے تو یہ ادب کی جانب سے ایک تاریخ ساز خدمت ہوگی۔

ابلاغ کا مسئلہ بھی ہمارے معاشرے میں ایک خاصا الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ نثر کی تو خیر بعض عام فہم اصناف اس کو حل کر لیتی ہیں لیکن شاعری میں جو مسلمات فن اور اختیارات ومروجات ہیں وہ اسے عوامی سطح سے بلند رکھنا چاہتے ہیں۔ بنیادی بات تو یہی ٹھیک ہے کہ شعر فہمی میں ایک خاص ذوق کی ضرورت ہوتی ہے، علم وشعور کی ایک بلند سطح، جذبے کی ایک لطیف اور پوشیدہ گہرائی، مذاق سلیم کی ایک خاص رفعت تفہیم شعری کے لئے درکار ہے۔

اسی لئے شاعری (بحیثیت مجموعی) عوام سے براہ راست خطاب نہیں کرتی ماسوائے اُن منظومات کے جنہیں تخلیق کرنے کے لئے ایثار پیشگی کے ساتھ شاعر کو خود عوام کی ذہنی سطح تک اترنا پڑا ہے۔۔۔اس کے باوجود معاشرے کی تشکیل نو کی خاطر اگر ہمارے شعرا کبھی کبھی اس ایثار کا ثبوت دے دیا کریں تو کیا حرج ہے' ہمارے ادب میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جب شعرائے عوام کی تشکیل ذہنی کے لئے اس سطح پر نزول قبول کیا اور اُن کا فنی جمال بھی مجروح نہیں ہوا، ایک المیہ یہ ہے کہ ہمارے ادب میں اب تک ہلکی پھلکی باتوں کو وزنی لہجے میں کہنے کا رواج ہے جبکہ معاصر ادب میں (جو بعض دوسری زبانوں میں عہد حاضر میں) تخلیق ہو رہا ہے۔ وزنی بات ہلکے پھلکے لہجے میں کہی جا رہی ہے۔۔۔ میں علامتی افسانوں اور علامتی اور تجریدی تجربات شعری کا مخالف نہیں، پردے اور اشارے میں بات کہنا کوئی بری عادت نہیں ہے لیکن ابہام کی وہ صورت نہیں ہونی چاہئے کہ تعبیر تک پہنچتے پہنچتے خواب ریزہ ریزہ ہو جائے' ہر ملک میں کہانی براہ راست عوام کے لئے لکھی جاتی ہے یا یوں کہیے کہ کہانی اپنی مختلف صورتوں میں اپنا ایک وسیع حلقہ اثر رکھتی ہے' اُس کے مفتوحین کی تعداد ہمیشہ بکثرت رہی ہے لیکن کیا علامتی افسانے نے اپنے دائرہ فتح وظفر کو محدود نہیں کر دیا ہے۔ تاہم یہ ایک تخلیقی تجربہ ہے اور اپنے خاص قارئین تک اس کا ابلاغ ہو رہا ہے۔ اگر علامت نگار ادبا معاشرے کی تشکیل نو کا مقدس فرض ادا کرنا چاہیں گے تو اُن کو کیا صورت اختیار کرنی پڑے گی۔

ہمارے یہاں اثر آفرینی کے ادبی ہتھیار تو بہت ہیں لیکن اثر پذیری کی رفتار کم ہے جس کے لئے ہمیں اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنا پڑے گا کہ ہمارے معاشرے میں خواندگی کی شرح کا تناسب بہت کم ہے۔ ہم جن کے لئے ادب تخلیق کرتے ہیں وہ عموماً ناخواندہ ہیں اور وہ شعوری سطح سے بات کو قبول کر ہی نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ ادب ہمیشہ جذباتی سطح ہی سے اثر انداز نہیں ہوتا۔ آخر جذبات انگیزی کے ساتھ ساتھ تفکر آفرینی کی ضرورت بھی تو پڑتی ہے۔ جنوں کے ساتھ حکمت، جوش کے ساتھ ہوش اور دیوانگی کے ساتھ فرزانگی کے اوصاف بھی تو معاشرتی ترکیب کے اجزا ہیں۔۔۔ ادب چاہتا ہے کہ کسان جاں فشانی سے کاشتکاری کرے۔ مزدور اور محنت کش افراد لگن سے محنت کریں۔ دکاندار گراں فروشی' ملاوٹ' بددیانتی سے گریز کرے۔ ہمارے کارکن طبقوں میں تکریم محنت کے جذبات پیدا ہوں اور سب لوگ اپنے فکر و عمل اور سعی و کوشش سے معاشرتی وقار اور قومی عزت میں اضافہ کریں۔ ان باتوں کی تفہیم

کے لئے ایک نظم پارہ یا نثر پارہ تخلیق کیا جاتا ہے، لیکن جس کے لئے یہ تخلیق عمل میں آئی ہے وہ ناخواندگی کے سبب اس کے ایک لفظ، ایک جملے، ایک مصرعے کے فہم کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا، ایسی صورت میں ادب معاشرے کی تشکیل نو میں موثر کردار کیسے ادا کر سکتا ہے۔ پہلا درجہ تعلیم کا ہے، پھر علم کا، ادب اور فن تو بعد میں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں تعلیمی استعداد اور علمی شعور کی آفرینش کے لئے پہلے معاشرے کے ارباب انتظام کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے تاکہ ادب کی تاثیرات کا مرحلہ شروع ہو سکے۔ تاہم اس صورتحال سے ادب کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔

قارئین کا جتنا حلقہ دستیاب ہے اُس پر نفوذ واثر کی تدابیر میں ادب کی جانب سے کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ابلاغ کے مسئلے میں ادبا کے چار گروہ ہیں پہلا گروہ کہتا ہے کہ ادب کو پورے معاشرے کے ذہن وفکر تک پہنچنا چاہئے' دوسرے گروہ کے نزدیک ادب کی رسائی پڑھے لکھے افراد تک ہونی چاہئے۔ تیسرے گروہ کی نظر میں ادب کا ابلاغ ادبا تک کافی ہے اور چوتھے گروہ کے ہر ادیب کے نزدیک ادب اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس کی بات اُسی تک پہنچ جانا ابلاغ ہے۔ اپنا لقمہ اپنے منہ تک، یہ آخری گروہ جو ایک طرح سے نومولود ہے اس حد تک ذات پرست ہے کہ اپنے کرب تخلیق اور اپنی مسرت آفرینی میں کسی کی شرکت کا متحمل نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذات گھنے، ادیب سے آپ کس معاشرتی رابطے کی توقع کر سکتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جب عطائے خود بہ لقائے خود ہی کا معاملہ ہے تو پھر ایسے ادیب کو چھپنے چھپانے کی تکلیف کیوں ہوتی ہے، بہتر ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ سے پوری ''کٹی'' کرلے۔ رہے باقی تین گروہ ادب ادیبوں تک''۔ یہ گروہ'' اپنی تخلیقات کے عمل واثر کو نہایت محدود کر لیتا ہے اور پھر دوسرے ادبا جو خود شغل تخلیق وتصنیف میں محو ہیں اُن کے پاس دوسروں کو پڑھنے اور ان سے تاثر قبول کرنے کا وقت اور جذبہ کہاں ہے؟ اور اگر وہ کسی وقت از راہ ادیب نوازی متاثر بھی ہوئے تو اُن کے اپنے تاثر سے معاشری فوائد کا کتنا امکان ہے؟ اب رہ گئی پڑھے لکھے لوگوں کی بات، ان خواندہ اصحاب کی شرح تناسب دیکھ لیجئے اور بے پڑھے لکھے افراد کی شرح ناخواندگی کا حساب لگا لیجئے۔ بات وہیں آجاتی ہے کہ ادب خود کو کس حساب سے دوسروں تک پہنچائے؟ اور یہیں سے معاشرے کے اُن فعال اور با اختیار افراد کی ذمہ داری شروع ہو جاتی ہے کہ وہ تعلیم کے مواقع اور امکانات کو وسیع تر کریں، تاکہ عوام کے اذہان علم وتعلیم کے ذریعے نرم وشاداب ہوں اور اُن میں ادبی

افکار کی کاشت کی جا سکے۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ نہ جانے کیا بھید ہے کہ ہمارے شعرا اور ادباء موضوعات کو چن بھی لیتے ہیں اُن کے پاس الفاظ، لہجہ، آہنگ، اسلوب، جذبہ اور فکر بھی ہے وہ ادب پارے کی بافت اور تعمیر بھی خوب کر لیتے ہیں۔ ماحول، فطرت، کائنات ہر جگہ سے اُن کی چشم مشاہدہ بہت سے مناظر و مظاہر کو سمیٹ لیتی ہے، پھر وہ تخلیقی صلاحیت و صداقت کے ساتھ انہیں ایک فنی اور ادبی پیکر میں جلوہ گر بھی کر دیتے ہیں لیکن اس تخلیقی پارے کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ادیب اُس سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا اور جس نتیجے کا استنباط اور ابلاغ اُس کے پیش نظر تھا وہ ہاتھ نہیں آسکا، جیسے اس تخلیقی سفر میں وہ راستہ اچانک کہیں گم ہو گیا جس کی منزل کی جانب وہ گام زن تھا۔ ممکن ہے میرے دوست کے اس تجزیے میں کوئی ایسا انحرافی رویہ کارفرما ہو جس کے شاید کچھ ذہنی اور نفسیاتی عوامل ہوں یا انہیں بکثرت ایسی تحریریں پڑھنا یا سننا پڑی ہیں جن میں صدف شکنی کے باوجود گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا ہو۔ تاہم اگر یہ ردعمل معقول ہے تو پھر معاشرے کی تشکیل نو کے نازک فریضے کی ادائی کے موقع پر ہمیں یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ بہت سے تخلیق پارے جو خدانخواستہ اپنے تخلیق کار کے خلوص کی کمی یا صلاحیت تخلیق کی کوتاہی یا فنی ریاضت کی تقصیر یا لہجے کی تھکن کے باعث اپنی تخلیق میں ادھورے رہ گئے وہ کم اثری یا بے اثری کے سبب معاشرے کے ذہن کو چھو نہ سکیں گے۔

ہمارے معاشرے میں اب تک یہ اچھی عادت موجود ہے کہ کہنے والے کی بات مان لیتے ہیں بشرطیکہ کہنے والا خود اپنی بات مان رہا ہو۔ یعنی جہاں قول کی تائید میں عملی اور پند کی معاونت میں اسوہ موجود ہو وہاں خاطر خواہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں ستم ظریفی یہ ہے کہ ادب خود اپنے مضمون و مفہوم پر پابند ہونے کا مکلف نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو واضح گروہ ہیں۔ مفکرین اور عاملین۔ ارباب فکر صرف سوچتے ہیں' کہتے، لکھتے ہیں اور تخلیق میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کا ادبی عقیدہ یہ ہے کہ ہم نے ایک نظم کہی ہے یا ایک افسانہ لکھا ہے ہمارا فرض پورا ہو گیا۔ ہم نے اپنے مخاطبین کو جذباتی اور فکری غذا مہیا کر دی ہے۔ ہم یہاں کام آچکے' آگے تمہارا کام ہے' اُدھر عوام ہر قول کے ساتھ قائل کا اپنا عمل دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ انہیں نظر نہیں آتا یا اس کے خلاف نظر آتا ہے تو عوام اسے نہ قبول کرتے ہیں نہ اختیار۔۔۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بعض دوسرے ممالک میں شاعر و ادیب مفکر بھی ہیں اور صاحب

عمل بھی ۔۔۔۔وہ دہقان پر نظمیں بھی کہتے ہیں اور خود دہقانی امور بھی انجام دیتے ہیں۔ وہ محنت کشوں میں احساس محنت پیدا کرنے اور ان کے معاشرتی حقوق کے تحفظ کے لئے لکھتے بھی ہیں اور خود ان کار گاہوں میں کام بھی کرتے ہیں جو قومی صنعت وحرفت کے فروغ میں جاری ہیں' اس طرح ان مفکرین کے افکار وخیالات کا عملی اطلاق خود ان پر بھی ہوتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور اپنے اشعار کے مخاطبین بھی' وہ کہانی لکھتے بھی ہیں اور افسانوی کرداروں میں تخلیقی لمحات گزار چکنے کے بعد زندگی کے میدان میں خود عملی کردار بن جاتے ہیں۔ معاشرے کی تشکیل نو کے سلسلے میں کیا ہمارے ارباب فکر' فکر کے ساتھ ساتھ عمل کی مثال بننے پر بھی غور کر سکتے ہیں؟

ہمارا معاشرہ ایک تو اپنا الگ وجود رکھتا ہے دوسرے اس کے اسلامی اور ثقافتی روابط عالم اسلام سے ہیں' تیسرے انسانی بنیادوں پر اس کا ایک علاقہ بین الاقوامی معاشرے سے ہے' یہ تینوں سطحیں ادب کے لئے موضوعات فراہم کرتی ہیں۔ ادب کو اپنے معاشرتی ماحول اور مسائل پر قلم اٹھانا چاہئے۔ بین الاسلامی معاشرہ سے ذہنی ارتباط کی بنا پر ایسے موضوعات زیر قلم لانے چاہئیں جن کے ذریعے ایک وسیع تر اتحاد کی فضا قائم ہو اور بین الاقوامی معاشرے سے ہمارا ادبی رابطہ ہمارے اپنے نقطۂ نظر کے تحفظ کے ساتھ ہو۔ اس رابطے میں ہمارا نظریہ حیات اور ہمارے دینی اور تہذیبی اصول مجروح نہ ہوں۔ ادب کی اس عالمی سطح پر قلم اٹھاتے ہوئے امن' ظلم و جنگ سے نفرت اور عدل ومحبت کی ترغیبات کے آفاقی موضوعات پر لکھ سکتے ہیں۔ اپنے معاشرے کی فکری اور ذہنی تشکیل وتعمیر کے لئے اپنے ان مسائل واحوال کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو ہنگامی سہی' لیکن جن کے اچھے یا برے اثرات ہمارے معاشرے پر پڑ سکتے ہیں۔ اپنے گردونواح اور اپنے سے نزدیک ودور واقعات کی جو لہریں اٹھتی ہوں' ادب میں ان کو ضرور سمونا چاہئے تاکہ افراد معاشرہ کے علم وشعور اور جذبہ وفکر کی تربیت ہو سکے۔ بدقسمتی سے بعض اہم اور دوررس مسائل کو ہنگامی سمجھ کر لائق التفات قرار نہیں دیا جاتا۔ لمحات گزراں میں ہمارے قریب وبعید میں جو موضوعات جنم لے رہے ہیں ان پر کتنا کم لکھا گیا اور اس طرح ہمارا ادب تشکیل ذہنی کے اس اہم رخ کو کس حد تک برابر نظر انداز کئے جا رہا ہے۔

ادبی تخلیقات کے سرچشمے ہر زبان میں ہر عہد میں موج زن رہتے ہیں اور ادباء کے اذہان ان سے سیراب ہو کر اپنے معاشروں کو زندگی کی تازگی اور نمو بخشتے ہیں۔ ہمارے اپنے ادب ہی کی طرح

معاصر ادب وجود میں آ رہا ہے۔ بہت سی تصانیف ترجموں کی شکل میں منتقل ہوئی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے البتہ غیر ملکی تخلیقات کو اپنے ادب میں ترجمہ کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ یہ ہماری اقدار حیات سے متصادم تو نہیں۔ ہمارا ادب معاصر ادب کے رابطے سے جس قدر استفادہ کرے گا ہمارا معاشرہ اتنی ہی وسعتوں کے ساتھ اپنے ذہن کو منور کر سکے گا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے ادب کے نظریاتی حصے اور آفاقی اجزا دوسری زبانوں میں منتقل ہوتے رہیں تاکہ عالم گیر سطح پر ہمارا معاشرتی اور ملی تعارف ہوتا رہے۔

افادے اور استفادے کا سلسلہ ایک تاریخی اور ثقافتی عمل ہے' اسے کچھ ضابطوں کے ساتھ جاری رہنا چاہیئے۔۔۔۔۔

ذرائع ابلاغ میں اب جو ادب پیش ہوتا ہے اُس کی خاصی چھان پھٹک ہونے لگی ہے اُس میں پاکیزہ تفریح کے عناصر بھی نظر آنے لگے ہیں اور اپنی اقدار حیات کی تبلیغ بھی اور تعمیری نقطۂ نظر کا فروغ بھی۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں جتنی بھی احتیاط اور دیکھ بھال ہو سکے مفید ہوگا کیونکہ ذرائع ابلاغ عوام سے بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں اور موثر ترین طریق اظہار و تاثیر ہیں۔ ادب کی پیش کش میں بڑے شہروں کے اہل قلم کے ساتھ ساتھ چھوٹے شہروں میں لکھنے والوں کی اب خاصی دادرسی ہونے لگی ہے اور اس طرح وہ جوہر قابل جو ازنظر افتادہ تھا سامنے آ رہا ہے۔ اس میں مزید ایثار و انصاف کی ضرورت ہے تاکہ ہر خطے کے ادیب اپنی خوبصورت علاقائی ثقافت و ادب کے پھول چنیں اور اس طرح ملی تشخص کا ایک حسین و جمیل گل دستہ مرتب ہو سکے۔ آخر ہر شہر ہر قریے اور بستی کے سوچنے اور لکھنے والوں کا حق ہے کہ وہ معاشرے کی جمال آفرینی میں حصہ لیں۔

معاشرے کا ایک اہم حصہ وہ ہے جو مختلف درسگاہوں میں کسی نہ کسی سطح پر زیر تعلیم و تربیت ہے۔ موجودہ دور میں ان کے نصاب ہائے تعلیم میں بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں اور بعض مضامین کا ترک و اختیار عمل میں آیا ہے جس سے ایک مثبت نقطہ نظر ابھرنے کا آغاز ہو چلا ہے۔ نصابی کتب کا جائزہ لینا اس اعتبار سے ضروری ہے کہ اس میں ادب کی شرکت کس نوعیت سے ہے۔ نثر میں ہنوز بعض ایسے اسباق شامل نصاب ہیں جن سے پاکستان کی بجائے ہندوستان کا تعارف ہوتا ہے۔ بعض ایسے مضامین سامنے آئیں گے جو فکری ارتقاء اور مقتضائے عہد کے اعتبار سے نہایت فرسودہ اور ناقابل استفادہ ہیں۔ نثر میں

ایسا سرمایہ شامل کتاب ہونا چاہئے جس سے نئی نسل اپنی تاریخ ' اپنے نظام اخلاق' اپنی ذہنی اور فکری تحریکات اور اپنے نظریہ ءحیات سے آشنا ہو سکے۔ کلاسیکی نثر کا حصہ برائے نام ہو' محض اس لئے کہ اس سے ہمارے لسانی اور ادبی سفر کا کچھ نقش ابھر سکے۔ شاعری کا انتخاب بھی اسی اعتبار سے ہونا چاہئے۔ جو اشعار مضر اخلاق ہوں یا جن میں یاس و نومیدی' رندی ہوسنا کی اور مرگ وفنا کے مضامین کی کثرت ہو ان کی بجائے مسرت' محبت' اخلاق' عالی ہمتی اور زندگی کے مثبت رویئے کی عکاسی ہونا چاہئے۔ عشقیہ مثنوی میں بھی اخلاقی ٹکڑے نکل سکتے ہیں۔ قصائد میں بھی مناظر قدرت اور حکمت و اخلاق کی تشبیب چنی جا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں قطعات و رباعیات کا ایک مفید مطلب ذخیرہ موجود ہے۔ اثر انگیزی' تعمیری نظمیں اور صحت مندر جحانات کی غزلیں (یا غزلوں کے جزوی اشعار) انتخاب میں آ سکتے ہیں۔ نئی نسل اور خصوصاً زیر تعلیم نسل کے ذہنوں کی دنیا کارگاہ شیشہ گری ہے۔ ان شیشوں کو شکست و ریخت سے بچا کر سلامت بھی رکھنا ہے اور ان کے جوہر کو اس طرح چمکانا بھی ہے کہ ان میں ہمارے ملی اور معاشرتی تشخص کا پُر جمال اور پُر جلال چہرہ بھی نظر آ سکے۔

حاصل گفتگو یہ کہ ادب اور معاشرے کے ارتباط سے انکار ممکن نہیں' اسی اعتبار سے ادب کو اپنی حد اختیار میں رہ کر معاشرے کے خدوخال سنوارنے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی سعی مسلسل کرنا ہوگی۔ معاشرے کے مختلف فعال اور موثر عوامل اس کی تعمیر نو اور تشکیل جدید میں مصروف رہتے ہیں۔ ادب بھی جذباتی اور شعوری ہر دو سطحوں پر اس کے وجود کو مجلّا کر سکتا ہے۔ ہمارا ادب اب تک اپنی واضح پہچان اور اپنے سفر کی مثبت سمت کا تعین نہیں کر سکا' یعنی وہ ابھی تک خود شناسی' خود آگہی کی صفات سے محروم ہے۔ اس صورت میں اسے پہلے اپنا تشخص بحال کرنا ہے پھر اپنے معاشرے کو تشخص بخشنا ہے' کیونکہ ہمارا معاشرہ مخصوص اور ممتاز ہے اور وہ ایک خاص نظریہ حیات کی اساس پر استوار ہوا ہے اس لئے ہمارے ادب کو اسی نظریے کا حامل اور اسی پر عامل ہونا ہے اور اسی کے فروغ میں حصہ لینا چاہئے۔ جب تک خود ادب کے رگ و پے میں یہ نظریہ پیوست نہیں ہو جاتا وہ خلوص نیت اور صدق عمل کے ساتھ اس کا ابلاغ کر ہی نہیں سکتا۔ ادب کو داخلی اور ارضی سطح پر اپنے معاشرے کی چہرہ آرائی کرنی ہے اور خارجی اور آفاقی طور پر (اپنی اقدار حیات کے تحفظ کی شرط کے ساتھ) عالمی انسانی معاشرے میں اقدار خیر پھیلانے کا کام بھی کرنا ہے۔ ہمارے افراد معاشرہ کس حد تک اور کس قدر ادب سے ذہنی مناسبت اور

ادب فہمی کا شعور رکھتے ہیں۔ اس الجھن میں پڑے بغیر خود کو تخلیقی جمالیاتی دائروں میں رکھتے ہوئے عوام کی ذہنی سطح تک اترنا ہوگا۔ ہمارا ذہن ہمارے پاس خدا کی امانت اور ہمارا قلم ہمارے ہاتھ میں ہمارے ضمیر کی صداقتوں کا آئینہ دار ہے۔ ہم خدا کی زمین میں اقدارِ خیر کی روشنی کو پھیلاتے اور آثارِ شر کی ظلمتوں کو ناپید کرنے کے لئے مامور ہوں۔ ہمیں ظلم اور مظلومیت، کذب اور صدق، بے اعتدالی اور عدل، رذالت اور شرافت، نفرت اور محبت، جنگ اور امن کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچنی ہوگی اور پاکستانی معاشرے سے بالخصوص اور عالمی معاشرے سے بالعموم بدی کا ہر دھبہ کھرچنا ہوگا اور نیکی کا ہر نقش اجاگر کرنا ہوگا۔ یہ سارا عمل خلوص بھی چاہتا ہے، ایثار بھی، لگن بھی، جاں فشانی بھی۔ چاہے اس راہِ عمل میں کتنے ہی موانعات راستہ روکیں، چاہے اس چراغ سے کتنی ہی آندھیاں ستیزہ کار رہیں لیکن ادب کو امن و محبت کا پرچم لے کر بڑھنا ہوگا، برابر بڑھنا ہوگا یہاں تک کہ مرجھائے ہوئے خوابِ امید و عزیمت کے موسموں میں جذب ہوکر سرسبز تعبیر بن جائیں۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

علی گڑھ تحریک اور اردو سوانح نگاری

تخلیقِ ادب میں شعوری فکر کے علاوہ حالات کا گہرا عمل دخل ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ قومیں جب بے عملی کا شکار ہو جاتی ہیں تو فکری سوتے بھی خشک ہونے لگتے ہیں۔ ان حالات میں ایک تخلیق کار کو معقولیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ حالات و واقعات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے کہ فہم و ادراک اس کی تائید کریں۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی، ۱۷۹۹ء میں سلطان فتح علی ٹیپو کی شہادت کے بعد یہ امر یقینی دکھائی دے رہا تھا کہ ظالم و سفاک، موذی اور مکار جابر قوتیں برصغیر میں مسلمانوں کی جائز اور قانونی حکومت کو برطرف کرنے پر تل گئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں یہ حادثہ ہو کے رہا۔ اس کے بعد ظلم، ناانصافی اور منظم غنڈہ گردی کے ذریعے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ انگریز مورخ ڈاکٹر ہنٹر نے اس وحشت ناک رویے اور بربریت پر اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''جب ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان سب قوموں سے بہتر تھے۔ نہ صرف وہ دوسروں سے زیادہ بہادر، جسمانی حیثیت سے توانا اور مضبوط تھے بلکہ سیاسی اور انتظامی قابلیت کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھا۔ لیکن یہی مسلمان آج سرکاری ملازمتوں اور غیر سرکاری آسامیوں سے یکسر محروم ہیں۔۔۔ اب یہ حالت ہے کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔''(۱)

فرنگی تہذیب و ثقافت کو اگرچہ اس زمانے میں مکمل طور پر ترقی یافتہ خیال کیا جاتا تھا مگر اخلاقی اور روحانی اعتبار سے وہ لوگ وحشی تھے۔ ہوس زر نے انہیں حق و انصاف اور نیکی سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ بے حسی اور بے غیرتی کا یہ عالم تھا کہ ہر وہ چیز جو ضمیر کو بیدار کرنے کا وسیلہ بن سکتی ہے اس کا قلع قمع کرنے کی ٹھان لی گئی۔ جب پورے برصغیر میں کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند ہو رہے تھے اور پورا ملک

فرنگی بوٹوں کے نیچے کچلا جا رہا تھا۔ سر سید احمد خان نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھا اور مسلمانوں کی بحالی کے لیے میدان عمل میں آ گئے۔ علی گڑھ تحریک کو تحریک پاکستان کی ابتدائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سر سید نے قومی تعمیر کے جس منصوبے کا آغاز کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، ذکاء اللہ اور شبلی نعمانی نے اس بنظر تحسین دیکھا۔ علی گڑھ تحریک میں سر سید کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں۔

''اس وقت ان کا حال بعینہ اس شخص کا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کو بچانے کے لیے وہ دیوانہ وار ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہو۔'' (۲)

سر سید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے مثبت انداز فکر پروان چڑھایا۔ سستی جذباتیت کو ترک کرنے کا مشورہ دیا اور عصری تقاضوں کے مطابق صورت حال کا سائنسی انداز فکر اپناتے ہوئے بے لاگ تجزیہ پیش کیا۔ اپنے نصب العین کے بارے میں سر سید نے واضح کیا۔

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج سر پر'' (۳)

۱۸۵۷ء کے المناک حالات کے بعد سر سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک کے دوسرے نامور ادیبوں نے فکر و نظر کو اس طرح مہمیز کیا کہ احساس و ادراک، تجربات و مشاہدات اور تخلیقی عمل کو نئی جہت نصیب ہوئی۔ مقصدیت اور اصلاح کا جذبہ غالب نظر آنے لگا۔ تعمیر و ترقی کا غلغلہ ہر سو بلند تھا۔ نئی اقدار روایات کو پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی۔ سر سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک کے بارے میں شبلی نعمانی کے یہ اشعار اس عہد کے حالات کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں:

صورت سے عیاں جلال شاہی　　چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ملک پہ جان دینے والا　　وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا　　اک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز　　اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے　　ہمت نے قدم بڑھائے آگے

وہ دوڑ چلے جو پابہ گِل تھے آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو بھی تھا عجیب جوش میں تھا مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے اخبار کہیں، کہیں رسالے
تعلیم کے جا بجا وہ جلسے گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے

سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقائے کار نے مغربی اصناف ادب کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے انہیں اردو میں مروج و مقبول بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی خواہش تھی افکار تازہ کے وسیلے سے جہان تازہ کی نمود کو یقینی بنایا جائے۔ سر سید احمد خان نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا آغاز کیا۔ ۱۸۵۸ء میں علی گڑھ تحریک کا باضابطہ آغاز ہوا تھا۔ اس کے پندرہ برس بعد آریا سماج تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ اس عرصے میں علی گڑھ تحریک نے ہندو عصبیّت کے مکر کا پردہ فاش کر دیا تھا۔ ادبی محاذ پر علی گڑھ تحریک نے مادّیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری پر توجہ دی۔ (۴) علی گڑھ تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اصلاح احوال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سنجیدہ نگاری اور سادہ نگاری کا ایسا انداز کہ ندرت اور لطافت کا عنصر قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ (۵) اس طرح جو ادب تخلیق ہوا اس میں فکر و خیال کو کلیدی اہمیت حاصل ہوئی۔ تخلیق کار کی تخلیقی فعالیت جب عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو حرفِ صداقت کی تاثیر اپنا لوہا منوا لیتی ہے۔ علی گڑھ تحریک نے حرفِ صداقت کے وسیلے سے زندگی میں ایقان کے اعجاز سے عمل اور جدو جہد کی افادیت کو اجاگر کیا۔ (۶) اور اس طرح قومی تعمیر و ترقی کے لیے ایک مثبت لائحہ عمل سامنے آیا۔

علی گڑھ تحریک نے سوانح نگاری پر اپنی توجہ مرکوز کی سوانح نگاری کے سلسلے میں بھی وہ انگریزی ادب سے متاثر تھے سوانح نگاری (BIOGRAPHY) کیا ہے اس بارے میں راس مارفن (ROSS MURFIN) لکھتے ہیں:

> "A written account of the life of a particular person from birth to death that attempts not only to elucidate the facts about that person's life and actions but also to draw a coherent picture of a self ,personality,or charactor"

سر سید احمد خان نے اولین سوانحی تصنیف "سیرتِ فریدیہ" کے نام سے مرتب کی۔ اس سوانحی

تصنیف میں سرسید نے اپنے نانا فرید الدین کے حالات زندگی لکھے ہیں ۱۸۴۷ء میں سرسید نے
''آثار الصنادید'' لکھی آثار الصادید میں دہلی کے بارے میں تاریخی حوالے سے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان
کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے دہلی کی سوانح عمری کہنا بے جا نہ ہوگا۔(۸)

اس کے بعد سوانح نگاری پر مولانا الطاف حسین حالی نے بھر پور توجہ دی سرسید احمد خان کی
سوانح نگاری انھیں پسند تھی اس موضوع پر انھوں نے ''حیات جاوید'' لکھی اس تصنیف پر انھوں نے
طویل عرصہ کام کیا کام کا آغاز ۱۸۹۳ء میں ہوا اور یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں مکمل ہوئی یادگار غالب لکھ کر حالی
نے غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے یادگار غالب کو غالب پر پہلی باقاعدہ سوانح کی حیثیت حاصل
ہے غالب کے بارے میں حالی بہت کچھ جانتے تھے۔

''حیات سعدی'' کو اردو سوانح نگاری میں کلیدی مقام حاصل ہے اردو سوانح نگاری کے
ارتقا پر نظر ڈالیں تو حالی کی یہ کاوش قابل قدر قرار دی جاسکتی ہے یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ انگریزی ادب
کے زیر اثر فن سوانح نگاری کا آغاز تو اردو میں ہو گیا مگر سوانح نگاری کے تجربے میں وہ پختگی عنقا ہے جو فن
سوانح نگاری کا اہم ترین تقاضا ہے۔ بعض حقائق کی کمی اور بعض غیر ضروری باتوں کی موجودگی قاری کو
ناگوار گزرتی ہے بعض اوقات جانبداری اور رواداری کا عنصر بھی کھٹکتا ہے مثلاً جب شیخ سعدی کے مذہب
کا ذکر کیا تو حالی نے اس مسئلے پر کوئی واضح رائے دینے سے گریز کیا اور یہ کہہ کر قاری کو حیرت زدہ کر دیا:

''ہم اس کو کسی خاص مذہب کا ثابت کر کے ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین
ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود نہیں بنانا چاہتے'' (۹)

سوانح نگار کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سوانح حیات، زندگی کی ایک ایسی تصویر کی
مانند ہے جس میں کاروان ہستی کے تیز گام ہونے کا ثبوت بھی ملنا چاہئے اور اس کے رہ نورد شوق کے
بارے میں تمام تفصیلات بھی من وعن بیان کر دینی چاہیں کسی بھی فرد کی زندگی کی یہ لفظی مرقع نگاری اس کی
زندگی کے سفر کے جملہ نشیب و فراز اس طرح پیش کرتی ہے کہ قاری چشم تصور سے تمام حالات و واقعات کا
مشاہدہ کر لیتا ہے۔ سوانح حیات کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر اسے تاریخی عمل سے الگ کرنا درست
نہیں۔ سوانح نگار کو صداقت کا پرستار ہونا چاہیے تاکہ اس کی تحریروں میں سائنسی انداز فکر کے اعجاز سے
صداقت کا عنصر نمایاں ہو۔

عالمی ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ادب میں سوانح عمریاں لکھنے کا رواج کافی قدیم ہے۔ سب سے پہلی سوانح عمری پلوٹارک نے دوسری صدی عیسوی میں تحریر کی۔(۱۰) علی گڑھ تحریک سے پہلے اردو میں سوانح نگاری کے بارے میں کہا جا سکتا ہے "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے"

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر حالی نے سوانح نگاری کے فروغ میں اہم خدمات انجام دیں۔ سوانح نگاری کے فنی تقاضوں اور جدید نقوش کو اردو میں روبہ عمل لانے کے سلسلے میں حالی کی خدمات تاریخ ادب کا اہم واقعہ ہیں۔ حالی کی سوانح سے اردو میں سوانح نگاری کے ایک اہم عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ کچھ خامیوں کے باوجود حالی کی سوانح عمریاں اپنے افادی پہلو کے اعتبار سے قابل قدر ہیں۔

شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴) نے علی گڑھ تحریک سے اثرات قبول کیے۔ سر سید احمد خان کے بیش بہا کتب خانے سے شبلی نے بھرپور استفادہ کیا۔ ان کی سوانحی تصانیف میں الفاروق ۱۸۹۹ء، المامون ۱۸۸۷ء، سیرۃ النعمان ۱۸۹۱ء، الغزالی ۱۹۰۲ء اور سوانح مولانا روم ۱۹۰۴ء کو اہم مقام حاصل ہے ان سب سے بڑھ کر سیرت النبی ﷺ ہے جسے وہ اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے اور سیرت النبی ﷺ لکھتے لکھتے عدم آباد کا رخت سفر باندھ لیا۔ انہوں نے خود کہا تھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم ﷺ　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

شبلی کی سوانح نگاری میں مورخانہ انداز نمایاں ہے۔ اصلاح اور مقصدیت کی تڑپ علی گڑھ تحریک کا ثمر ہے۔ شبلی کے سوانحی اسلوب میں کارلائل کا پرتو جلوہ گر ہے۔ سوانح نگاری کے وسیلے سے تاریخ کے حالات اور واقعات سے زیادہ شخصیات کے کارہائے نمایاں کی طرف توجہ مبذول کرانا شبلی کا امتیازی وصف ہے۔

علی گڑھ تحریک سے وابستہ ادیبوں نے سوانح عمری کو ایک انسان کی تاریخ کے حوالے سے پیش نظر رکھا۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری کو تاریخ نویسی کی ایک صورت میں پیش کیا گیا۔ ان سوانح نگاروں نے موضوع، مواد اور بیان کو اپنے اسلوب کے اعجاز سے تاثیر اور دلکشی کی انتہا تک پہنچا دیا۔ اس عہد میں سوانح نگاری کے شعبہ میں جو کام ہوا اس سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا۔ فکر و خیال کی رفعت اور اظہار بیان کی تاثیر کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ مصلحت اندیشی سے گریز کرتے ہوئے

حرف صداقت لکھنا اپنا مطمح نظر بنالیا جائے ان سوانح نگاروں نے اپنی مخصوص طرز ادا کے باعث اپنے عہد کو تاریخ میں محفوظ کر لیا۔ ذیل میں چند ممتاز سوانح نگاروں کی تخلیقی کامرانیوں کا احوال بیان کیا جاتا ہے۔

(ا) احمد حسین الہ آبادی کی سوانحی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) حیاتِ سعدی (۲) حیاتِ ذوق (۳) حیاتِ نورالدین محمود

(۴) حیات سلطان صلاح الدین۔

(ب) میرزا حیرت دہلوی کی سوانحی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلوب پر حالی اور شبلی کے اثرات نمایاں ہیں ان کی سوانحی تصانیف درج ذیل ہیں

۱۔ حیات طیبہ، (سنِ تالیف ۱۸۹۴) یہ شاہ اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری ہے

۲۔ حیات فردوسی، ۳۔ سیرت محمدیہؐ ۴۔ نورتنِ اکبری مع سوانح عمری۔

۵۔ سوانح عمری زیب النساء بیگم

(ج) فیروز ڈسکوی نے سوانح نگار کی حیثیت سے تذکرہ اور تاریخ کا اسلوب اپنایا ہے ان کی تصنیف حسب ذیل ہے۔

سیرت النبی (پیارے نبی کے پیارے حالات) یہ سوانحی کتاب ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔

(د) منشی محمد دین فوق نے علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر ادب تخلیق کیا ان کی سوانحی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ ابوالحسن ملا دو پیازہ	۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ
۳۔ کشمیر کی رانیاں	۴۔ یادِ رفتگاں
۵۔ غنی کاشمیری	۶۔ لللہ عارفہ
۷۔ تذکرہ خواتین دکن	۸۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی

مولوی نذیر احمد دہلوی اردو کے ممتاز ادیب ہیں موضوع اور خاص طرز ادا کی بدولت ان کی تحریروں کو سند کا درجہ حاصل ہے ''امہات الامہ'' کی تصنیف نے انھیں اردو سوانح نگاروں میں اہم مقام پر فائز کر دیا۔ علی گڑھ تحریک کے فیضان سے اردو ادب کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بے

پناہ مدد ملی اس تحریک کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا اس سے بے عملی اور بے یقینی کی مسموم فضا کے خاتمے کو یقینی بنادیا گیا ذہنی بیداری کی ایسی فضا پیدا ہوئی جس نے اردو کے فکری سرمائے کو وسیع کر دیا حریت فکر اور اخلاقی صداقتوں پر ایمان پختہ تر ہوتا چلا گیا اور ادب کے وسیلے سے آزادی کا تصور پروان چڑھا۔

ادب اور زندگی کا گہرا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فکر و خیال کے سوتے زندگی کے تجربات و مشاہدات ہی سے پھوٹتے ہیں علی گڑھ تحریک نے عملی زندگی اور جدو جہد پر اپنی توجہ مرکوز رکھی علی گڑھ تحریک نے اردو میں سوانح نگاری کے وسیلے سے جو طرز ادا اپنائی اس کے معجز نما اثر سے ملی بیداری اور قومی حمیت کے جذبات کو نمو ملی برصغیر کی ملت اسلامیہ کو اپنے اسلاف کے فقید المثال کارناموں اور لائق صد رشک کردار سے کما حقہ آگاہی نصیب ہوئی اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک نے جامد و ساکت اور بے روح اجسام کو زندگی کی حیات بخش تڑپ سے آشنا کیا ان سوانح عمریوں نے دلوں میں ہلچل پیدا کر دی ان کی ہمہ گیر اثر آفرینی کا ایک عالم معترف ہے اس تحریک کا میر کارواں سرسید تھا جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے

ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت زآواز درایم کارواں شد

مآخذ

۱۔ محمد اکرام شیخ ڈاکٹر۔موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع پانزدہم، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۷۶

۲۔الطاف حسین حالی۔حیات جاوید، اکادمی پنجاب ٹرسٹ، لاہور فروری ۱۹۵۷ء، صفحہ ۳۹۳

۳۔محمد اکرام شیخ ڈاکٹر موج کوثر صفحہ ۱۴۶

۴۔عبداللہ ڈاکٹر سید۔سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲۵۱

۵۔شوکت سبزواری ڈاکٹر۔معیار ادب، مکتبہ اسلوب ناظم آباد، کراچی اشاعت اول ۱۹۶۱ صفحہ ۹۱

۶۔عبداللہ ڈاکٹر سید۔مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول، فروری، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۸۴

۷۔ Ross Muslim, The Bedford Glossary of critical and literary terms
New york1998,Page 33

۸۔شاہ علی سید ڈاکٹر۔"سوانح نگاری" مضمون مشمولہ تاریخ ادبیات، جلد ۹، جامعہ پنجاب لاہور طبع اول،

۹۔فیاض محمود سید۔تاریخ ادبیات، جامعہ پنجاب، لاہور، طبع اول ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۳۹

۱۰۔الطاف فاطمہ۔اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، اردو اکیڈمی سندھ، اپریل ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۶

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

دانش افرنگ، اشتراکیت اور اقبال

دانش افرنگ سے اقبال کے تعلق، ترک فرنگ کی دعوت اور اشتراکیت کی تحریک پر اقبال کی توجہ اور تبصرے کا معاملہ و تجزیہ ایک دلچسپ لیکن نہایت معنی خیز عمل ہے۔ اس مطالعے اور تجزیے کے دوران متعدد مقامات ایسے آتے ہیں کہ جہاں معروضیت متاثر ہو سکتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انہی مقامات پر توقف، تدبر اور تحمل کے ساتھ تفکر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دراصل اقبال کا زاویہ نگاہ مقامی یا محدود نہیں، بلکہ عالمگیر ہے۔ اس لئے ان کی تنقید و تحسین محدود و معین مقاصد کی بجائے انسانیت ساز اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ اسی پس منظر میں جب ہم مغرب سے متعلق ان کے طرزِ فکر کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو نمایاں رجحان نظر آتے ہیں۔ 1 ایک رجحان وہ ہے جس کے تحت اقبال مغربی علوم و فنون اور خصوصاً طبعی علوم میں ان کی حیرت انگیز ترقیات کو سراہتے ہیں۔ وہ مغرب کی علمی ترقی کو قرونِ وسطیٰ کی مسلم دنیا کی علمی ترقی کا تسلسل قرار دے کر اپنے لوگوں کو اس تسلسل کو برقرار رکھنے میں اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے فکرِ غرب سے ذاتی سطح پر استفادہ کیا اور ہمیشہ اس کی طرف متوجہ رہے۔ اس توجہ میں تنقید و تحسین دونوں شامل ہیں۔ تاہم ان کا واضح رجحان یہ نظر آتا ہے کہ مغرب کے عقلی اور معروضی تجربات کے نتائج کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور انسان کے فکری ارتقاء کا ایک اہم باب بھی، اسے نظر انداز کر کے ہم فکری تاریخ کے تسلسل کو نہیں توڑ سکتے۔ ان کی نظر میں مغرب میں سولہویں صدی کے بعد مذہب سے کلی انکار کا ایک رویہ یا دوسرے لفظوں میں خوگر محسوس ہونے کا رجحان اپنی تمام تر قباحتوں سمیت، رفتہ رفتہ مذہب کے اثبات کی طرف ہی گامزن ہے اور اس بات کو تو خود محسوس بھی کیا جا سکتا ہے کہ انسانی عقل کے لئے ''بے مہار'' ہونے کا یہ تجربہ بہر حال لازمی تھا اور نتیجہ خیز بھی۔

بانگِ درا کے حصہ اوّل و دوم میں شامل مغربی شعراء کے کلام سے ماخوذ یا متاثر نظمیں ہوں یا ان کی ۱۹۱۰ء والی ذاتی ڈائری میں درج مغربی حکماء و شعراء سے متعلق دلچسپ تاثرات، تشکیل جدید کے خطبات میں مغربی فلاسفہ پر تنقید و تحسین کا ابلاغ ہو یا جرمن شاعر اور حکیم گوئٹے کے دیوان کا جواب۔ یہ

بات صاف طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اقبال فکرِ مغرب سے واقف و متاثر رہے اور جہاں بھی توصیف و تحسین کا مقام آیا اقبال کبھی بخل سے کام نہیں لیتے بلکہ یوں ہے کہ وہ مغربی شعراء و حکماء کا ذکر بڑی ہی سرشاری کے عالم میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ذاتی ڈائری (۱۹۱۰) کے اوراق کو چھو کر دیکھئے تعریف و توصیف کی ایک دلکش دنیا آباد نظر آئے گی۔ انگریز شاعر اور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کی اس سے زیادہ توصیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ زندگی کی عمیق ترین حقیقتوں کو سادہ حکایتوں اور تمثیلوں کی صورت میں واضح کرنے کے لئے درکار نادر الوجود فطانت کی حامل دو شخصیتوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مولانا جلال الدین رومیؒ کے ساتھ تیسری شخصیت ولیم شیکسپیئر کو قرار دیا ہے[۲]۔ شیکسپیئر اور گوئٹے پر تبصرہ دراصل انگریز اور جرمن رجحان کے فرق کا مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں تخلیق کے تصور ایزدی پر باز فکر کرتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک اہم فرق ہے۔ واقعیت پسند انگریز ''انفس'' کی باز فکر کرتا ہے اور عینیت پسند جرمن ''آفاق'' کی۔ گوئٹے کا فاوسٹ محض برائے نام فرد ہے۔ درحقیقت وہ انسانیت کی تجسیم ہے[۳]۔

جرمن حکیم گوئٹے کے ڈرامے فاؤسٹ کو تو اقبال الہامی کارنامہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گوئٹے نے اس قصے میں نسلِ انسانی کے تمام تجربات سمو دیئے ہیں۔ اقبال کا یہ تاثر بھی گوئٹے کی حکمت کی طرف ان کی توجہ کو نمایاں کرتا ہے کہ گوئٹے کے تخیل کی بے کرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامانی منکشف ہوئی[۴]۔ اقبال واضح طور پر یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی[۵]۔ انگریز شعراء اور انگریزی شاعری نے بھی اقبال کو متاثر کیا۔ خصوصاً انگریز رومانوی شعراء کا کلام اقبال کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جیسا کہ ذکر ہوا ہے بانگِ درا کے پہلے حصے میں انگریز شعراء ایمرسن، ولیم کوپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کی نظموں سے ماخوذ کلام موجود ہے۔ ورڈزورتھ کے بارے میں اقبال بتاتے ہیں کہ اس کے مطالعے نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچالیا[۶]۔ انگریزی کے نامور شاعر ملٹن کے موضوعات اقبال کو متاثر نہیں کرتے لیکن اپنے مقصد سے اس کے خلوص کی اقبال بڑی قدر کرتے ہیں۔ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ کوئی شاعر اپنے مقصد میں اس سے زیادہ مخلص نہیں گزرا۔ اس کے بلیغ اسلوب کو جو جھوٹے دیوتاؤں کا ایک عظیم

الشان حرم ہے زمانے کے مفلوج ہاتھ کبھی چھو نہ سکیں گے[۷]۔ انیسویں صدی کے انگریز شاعر رابرٹ براؤننگ پر اقبال کا ایک تبصرہ تحسین اور تفہیم کا ایک خاص رنگ لئے ہوئے ہے۔ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ تمام فلسفیانہ غور وفکر کا حاصل یہ ہے کہ علم مطلق ناممکن ہے۔ انگریزی شاعر براؤننگ بڑی ہنرمندانہ دلیل کے ذریعے اس ''ناممکن'' سے ایک اخلاقی کام لیتا ہے۔ شاعر یہ درس دیتا ہے کہ انسانی علم کی بے یقینی، اخلاقی ترقی کی ایک ضروری شرط ہے۔ کیوں کہ کامل علم، انسانی اختیار کی آزادی کو ختم کر دے گا[۸]۔

اس ڈائری میں کانٹ، ہیگل اور نطشے میں اقبال کی دلچسپی کا سراغ بھی ملتا ہے اور افلاطون پر ارسطو کی تنقید کے پیچھے کارفرما ذہنیت سے بیزاری کا اظہار بھی۔ وہ جرمن مذہبی عالم اور مصلح مارٹن لوتھر کی توصیف کرتے ہیں اور اس کی تحریک اصلاح کے اثرات پر تو ان کی گہری نظر ہمیشہ رہی۔ اقبال نے یہ ڈائری ۱۹۱۰ء میں لکھی۔ اس وقت ان کی عمر اندازاً تینتیس برس تھی۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ ایک نوجوان کے جو اپنی تعلیم مکمل کر کے پیشہ ورانہ زندگی اور جدوجہد میں مصروف ہو غور وفکر کے موضوعات کیا ہیں۔ اس ڈائری کے وسیلے سے ہم نوجوان اقبال کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اخذ و قبولیت یا تحسین و تنقید کے لئے ایک مضبوط نظام موجود رہا ہے۔

تاہم اس ڈائری میں اقبال نے ولندیزی فلسفی سپنوزا کی تعریف جن الفاظ میں کی ہے وہ حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ تاہم اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب کے مخالف محض نہ تھے جہاں جہاں سے وہ متاثر ہوئے اس کا انہوں نے اعتراف کیا لیکن جہاں انہوں نے مغرب سے اختلاف کیا ہے وہ بالکل اصولی معلوم ہوتا ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور یہ وضاحت ہمارے اصل موضوع سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اقبال نے مغربی تاریخ کے مشاہیر کا گہرا مطالعہ کیا اور اس مطالعے سے کسی نہ کسی طور پر متاثر بھی ہوئے۔ تاہم اقبال غیر ملکی زبان و ادب، تاریخ اور تہذیب وتمدن کے یک طرفہ مطالعات کے نقصانات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی عمرانی زندگی کی وضاحت میں جو خطبہ دیا اس کے بیشتر مباحث کا سراغ ان کی ۱۹۱۰ء کے وسطی مہینوں میں لکھی گئی ڈائری میں مل جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں اقبال جب یہ خطبہ ارشاد فرما

رہے تھے تو بیشتر معاملات پر ان کی رائے اپنی واضح شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس خطبے میں انھوں نے اپنی کمیونٹی کی تعلیمی حالات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ نوجوانوں کو اسلامی تہذیب و تمدن کے عقلی پس منظر کے بغیر محض مغربی تعلیم دینے کے خلاف نظر آتے ہیں۔

اس بحث میں وہ غیر ملکی ادبیات اور تاریخ و تہذیب کے پر جوش مطالعات اور ان کے اثرات ونتائج کو تبدیلی مذہب کے نتائج سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا نوجوان جو ابھی تک اپنی ملت کی تاریخ حیات سے افسوس ناک حد تک ناواقف ہے اپنے طرزِ عمل کو متعین کرنے کی خاطر رہنمائی حاصل کرنے کے لئے مغربی تاریخ کے مشاہیر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے وہ مغرب کا غلام ہے اور اسی وجہ سے اس کی روح صحت مندانہ خودداری سے عاری ہے۔ ایسی خودداری صرف اپنی ہی تاریخ اور ادبیات عالیہ کے مطالعے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اپنی تعلیمی جدوجہد میں آج ہم نے اس حقیقت کا جس کا تلخ تجربہ ہم پر اپنا دباؤ بڑھاتا جا رہا ہے بمشکل احساس کیا ہے کہ ایک غیر ملکی اور اجنبی تہذیب وتمدن کو بڑے پر جوش طریقے سے اپنائے رکھنا گویا غیر محسوس طریقے سے اس تہذیب و تمدن کا حلقہ بگوش ہونے کے مترادف ہے۔ ایسی حلقہ بگوشی کے نتائج تبدیلی مذہب کے نتائج سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں"[9]۔

علاوہ بریں دیگر کلام کے حوالے سے شوپن ہاور، آئن سٹائن، بائرن، نطشے، ہیگل، گوئٹے، برگسان، لینن اور کارل مارکس کا ذکر عموماً انسانی فکر کے کسی نہ کسی مثبت حوالے سے بھی آیا ہے جو یہ باور کراتا ہے کہ اقبال نہ صرف ان مفکرین کی طرف متوجہ تھے بلکہ ان کا زاویہ نگاہ بھی مخالفانہ نہیں، ہمدردانہ تھا۔ اسی طرح جب ہم تشکیل جدید کے مباحث میں حکمائے مغرب کے حوالے دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفی اقبال فکری طور پر مغرب سے کس طور پر منسلک ہے۔ ہر چند کہ اقبال کے مجموعی فکری نتائج، عمومی مغربی تفکر سے مختلف ہیں لیکن جیسا کہ ہم تشکیل جدید کے خطبات میں دیکھتے ہیں وہ جا بجا حکمائے مغرب کے افکار ونظریات کو اپنے استدلال کی تائید میں لاتے ہیں۔ یوں تو ان مغربی حکماء وفلاسفہ کی تعداد ۸۳ کے قریب ہے جن کا خطبات میں کسی نہ کسی حوالے سے ذکر آیا ہے لیکن مباحث کے اعتبار سے رینے دیکارٹ، مارٹن لوتھر، کانٹ، آئن اسٹائن اور ہنری برگساں اہم ترین اور اپنی اپنی فکر کے نمائندے بھی۔ حکیم آئن اسٹائن کے طبیعاتی اصولوں اور برگساں کے نظریہ تغیر زمان سے تو اقبال تائید حاصل کرتے نظر

آتے ہیں۔ اقبال نے دیکھا کہ رینے دیکارٹ نے فرد کو غلامی سے آزاد تو کرالیا اور یوں گویا ریاضیاتی عقل اور محض مادیت کو فروغ دے کر مغرب کو عقلیت اور مادیت کی مضبوط بنیاد بھی فراہم کر دی۔ فکری اعتبار سے دیکارٹ کے اس کارنامے کی وقعت جو بھی ہو لیکن جب ہم اقبال کی تنقید مغرب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ تنقید انھی نتائج پر استوار ہوتی ہے جو دیکارٹ (اور ان کے ہم خیال مفکرین) کی فکر نے مغرب میں پیدا کیے۔ اسی طرح وہ مارٹن لوتھر کے اس کارنامے کو تو سراہتے ہیں تو اس نے کلیسائی آمریت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور یوں مغرب کو مذہبی استبداد سے نجات دلائی لیکن اس تغیر کے منطقی نتیجے کے طور پر جو وطنی، نسلی و لسانی قومیتیں وجود میں آ کر باہم برسرِ پیکار ہوئیں اور اس سے انسانیت کا مطمح نظر محدود ہو کر رہ گیا، اس پر اقبال تنقید کرتے ہیں۔ روسو کے بارے میں اقبال کا رویہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

یہ تو فلاسفہ و حکماء کی تحسین و آفرینی کا ذکر تھا۔ اقبال من حیث المجموع، مغرب کی فکری مساعی کے معترف ہیں اور خاص طور پر مغرب کی جس چیز نے اقبال کو بے حد متاثر کیا وہ مغربی طبائع کی عمل پسندی ہے۔ اقبال مثنوی اسرار خودی کے دیباچے میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اس وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لئے ان کے ادبیات و تخلیات اہلِ مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں''[10]۔

وہ مغربیوں کی حس واقعات کو بھی سراہتے ہیں کہ یوں تو ہر زندہ انسان مختلف قسم کے واقعات سے ہر وقت دو چار ہوتا رہتا ہے لیکن ان وقوع پذیر واقعات سے مثبت اور عملی نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت جس قدر مغربیوں میں ہے وہ مشرق کی تخیل پرست اقوام میں مفقود ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ،فکرِ اقبال میں لکھتے ہیں کہ اقبال مغرب کے عیوب کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں سے بھی بخوبی واقف اور ان کا مداح تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمان وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کریں۔ علم مومن کا گمشدہ مال ہے۔ علم جہاں سے بھی ملے فرنگ میں ہو یا چین میں، مسلمان کو اس کی طرف اس طرح لپکنا چاہیے جس طرح انسان بازیافتہ گمشدہ مال کی طرف لپکتا ہے۔ آگے چل کر ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب مخصوص خوبیوں سے معراء نہ تھی۔ اس نے بہت کچھ پیدا کیا تھا جس کی ضرورت ملتِ اسلامیہ کو بھی تھی لیکن مسلمانوں کی جو کیفیت تھی اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مغرب کی خوبیوں اور اس کے کمالات کا راگ ان کی ذہنی، معاشی اور تہذیبی زندگی کے لئے مفید نہ ہو سکتا تھا۔ علم و فن میں یورپ کے

کمالات اقبال کی نظر سے اوجھل نہ تھے مغرب کے حاصل کردہ کمالات کچھ اسی نظریہ حیات کی بدولت تھے جسے اقبال اسلامی سمجھتا تھا لیکن دین سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے مغرب ان قوتوں کا صحیح استعمال نہیں کر رہا تھا۔ اقبال چاہتا تھا کہ مغرب انسانیت کی تکمیل میں روحانیت کے عنصر کو بھی ترقی دے اور مسلمان مغرب کی کورانہ تقلید میں صورت پرست ہو کر روح حیات سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ اقبال کی خواہش تھی کہ علم و فن یورپ سے حاصل کرو لیکن روحانیت اور اخلاقیات کا جو سرمایہ تم کو اسلام نے عطا کیا ہے اس بیش بہا وراثت کی قدر کرو تا کہ تم شرق و غرب دونوں سے افضل اور مکمل تہذیب پیدا کر سکو"۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اقبال ترکِ فرنگ کے داعی بھی ہیں۔ فرنگ یعنی مغربیوں کے مکر و فریب، منافقت، کمزور اقوام پر ظلم و تشدد اور حد درجہ حرص و ہوس نے اقبال کو حکمتِ مغرب کے نتائج سے مایوس کر دیا جو حکمتِ خیر اور فلاح کا باعث نہ بنے وہ حکمتِ فرعونی ہے اور اقبال اس سے بے زار ہیں۔ وہ برملا اس حکمتِ فرعونی کے مظاہر سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ یہ تہذیب انجام کار برباد ہو کر رہے گی۔

تہذیب تو ی کارگہ شیشہ گراں ہے　　　آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام　　　وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام

جب ہم اقبال کی تنقید مغرب کا لب و لہجہ دیکھتے ہیں تو بسا اوقات اس کی تندی و تیزی ہمیں حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے لیکن ایک بات ابھی سے طے کر لینی چاہیے اور وہ یہ کہ اقبال جو مغرب سے متاثر بھی ہیں، مغرب کی کس چیز کی مخالفت کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ نہ تو مغربی علوم و فنون کے مخالف ہیں اور نہ ہی حاصل کردہ ترقیات کے، ان کی مخالفت بنیادی طور پر جدید مغربی تہذیب و تمدن اور بے راہ روی پر ہے اور یہ کہ ان کی مخالفت روحانیت سے انکار کے باعث جنم لینے والی فکری بے راہروی پر ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا اعتراض مغربی فکر کی بجائے اس سے اخذ شدہ نتائج اور ان نتائج کی بنیاد پر اختیار کئے جانے والے طرزِ عمل پر ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ جو فکر انسان کو تخریب کی طرف لے جائے وہ انسانی نقطہ نظر سے مضر ہے چنانچہ مغربی فکر بھی اقبال کی تنقید سے نہیں بچ سکی۔

تہذیب مغرب پر شدید اور دو ٹوک تنقید کا یہ سلسلہ واضح طور پر تقریباً ۱۹۰۷ء سے شروع ہوتا

ہے اور اقبال کے فکری ارتقاء کے ساتھ ساتھ نشو ونما پاتا ہوا آخر دم تک پوری شدت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ مزید بحث سے پیشتر دلچسپ ہوگا کہ ۱۹۰۷ء کے لب ولہجہ اور ۱۹۳۸ء کے لب ولہجہ کا موازنہ کرلیا جائے۔ قیام یورپ کے دوران اقبال نے مغربی قومیتوں کی استعماریت اور پست وطنیت اور ان سب کی پروردہ کمتر تہذیب کو ملاحظہ کرتے ہوئے اس پر اپنا ردِعمل یوں ظاہر کیا:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے! کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اس کے بعد دیکھئے کہ قریباً اکتیس برس بعد یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سے نشر ہونے والے سالِ نو کے پیغام میں اقبال کا لب ولہجہ کس قدر تند وتیز ہے۔ ''اس زمانے میں ملوکیت کے جبرو استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبشہ، ہسپانیہ ہو یا چین ایک قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارے جارہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جارہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہوجائے گا جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کرسکے گا''۔[۱۲]

اس اقتباس میں اقبال کے لب ولہجہ کی شدت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اقبال نے ۱۹۰۷ء میں جس تہذیب کے خودکشی کرنے کی بات کی تھی، ۱۹۳۸ء میں اس تہذیب وتمدن کے ہاتھوں انسانیت کشی کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس سارے فساد کی جڑ وہ:

۱۔ نام نہاد جمہوریت اور ناپاک قوم پرستی

۲۔ ذلیل ملوکیت

۳۔ جغرافیائی وطن پرستی

رنگ ونسل کے امتیازات کو قرار دے رہے ہیں۔

تاہم مغربی سیاست اور تہذیب وتمدن کے متعلق ان فکری نتائج تک تو اقبال جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ۱۹۰۷ء کے اوائل میں ہی پہنچ چکے تھے جب کہ انہیں یورپ کا قریب سے مشاہدہ ومطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ,فکرِ اقبال میں لکھتے ہیں کہ "......اقبال کو یورپ میں رہنے، حکمت فرنگ سے گہرا تعلق پیدا کرنے اور اس کی تہذیب وتمدن کا براہِ راست مشاہدہ کرنے سے طرح طرح کے فائدے پہنچے۔ اقبال کی نظر آغاز ہی سے محققانہ تھی اس لئے اس کی زندگی میں مغرب کی کورانہ تقلید کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ اس نے یورپ کے سطحی جلوؤں کو بھی دیکھا، مگر اس کے ساتھ ہی وہ اس کے باطن پر بھی گہری نظر ڈالتا گیا۔ اس نے فرنگ میں علم وہنر کے کمالات اور انسانی زندگی کے بہبود کے لئے ان کے مفادات کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سے بھی آگاہ ہوگیا کہ اس کی تعمیر میں ایک خرابی کی صورت بھی مضمر ہے۔"[۱۳] قیام یورپ کا دور افکار اقبال مشاہدات میں تنوع کا دور ہے اس دور میں ان کے سیاسی، معاشرتی اور ادبی افکار میں دور رس تغیرات رونما ہوئے اور خود ان کے الفاظ میں یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کر دیا[۱۴] سیاسی نظریات ہوں یا یورپ کا معاشرتی مطالعہ دونوں نے اقبال کا اپنے تمدن پر اعتبار مستحکم کیا۔ یورپی سیاست کا کھوکھلا پن اور ثقافت کی ناپائیداری کا ادراک اقبال کو اسلام کی طرف راغب کرتا ہے۔

قیامِ یورپ کے سہ سالہ دور میں اقبال نے مغربی اقوام کی سیاسی ترقی وعروج کے اسباب کا مطالعہ کیا جن کی وجہ سے انہیں ساری دنیا میں بالادستی حاصل ہوگئی تھی۔ اس مطالعے کا دوسرا رخ مشرقی اقوام، خصوصاً بلادِ اسلامیہ کے زوال وپسماندگی کی وجوہات معلوم کرنا تھا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں اقبال پر مغربی استعمار کے وضع کردہ وہ حربے عیاں ہوئے جو اس نے اقوام مشرق کو غلام بنائے رکھنے کے لئے اپنائے ہوئے تھے اور اقبال کے اپنے الفاظ میں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

گویا اقبال نے بھانپ لیا کہ استعمار کا سب سے بڑا اور مؤثر حربہ وطنیت اور قومیت کا مغربی تصور تھا۔ اقبال دیکھ چکے تھے کہ مغربی استعمار نے اس حربے سے مشرقی اور اسلامی ملکوں کے حصے بخرے کر کے انہیں آپس ہی میں برسرِ پیکار کر دیا۔ اس مشاہدے سے وہ جغرافیائی حد بندی یا نسل و رنگ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے وطن کے تصور سے متنفر ہو گئے لیکن مغربی سیاست و ریاست اور تہذیب و تمدن کی بنیادیں چوں کہ انہی اعتبارات پر استوار تھیں اس لئے یہ سب اقبال کی مخالفانہ تنقید کی زد میں آتے ہیں۔

مغرب زدگی سے تو اقبال ہمیشہ محفوظ رہے نہ تو وہ یورپ جانے سے پہلے مغربی تمدن سے مرعوب تھے اور نہ ہی یورپ جا کر اور وہاں سے واپس آ کر مرعوب ہوئے۔ اس کے برعکس ان کی تنقید مغرب شدید صورت میں اس لئے سامنے آئی کہ انہوں نے مغربی معاشرے کے احوال کو قریب سے دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی اور بے مایہ ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ صنعتی انقلاب نے احساس مروت کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ مادہ انسان کو بہت کچھ دیتا ہے لیکن یہ اندھی مادیت انسان سے صرف انسان کو چھین لیتی ہے۔ اقبال نے دیکھا کہ یورپ میں صنعتی ترقی نے ایک نئی اخلاقیات کو جنم دیا اور وہ نئی اخلاقیات نفسانفسی کی اخلاقیات تھی۔ اس اخلاقیات نے معاشرتی سطح پر جہاں ماں باپ، بیٹے، بہن اور بیوی کے رشتوں کو عملاً صنعت و حرفت کے کارکن بنا کر رکھ دیا اور ان کے مابین جو رشتہ اخوت و مروت کا تھا اسے خالصا مادی مفادات کی تحویل میں دے دیا وہاں بین الاقوامی سطح پر استحصال اور نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کے رجحانات پروان چڑھائے اور یہ رجحانات اپنی دوسری صورتوں میں آج تک کارفرما ہیں۔ اقبال کی تنقید انہی امور و رجحانات کے خلاف ہے۔ اقبال انسان دوست مفکر ہے اس لئے وہ انسان کو نقصان پہنچانے والی ہر شے، ہر فکر کی مخالفت کرتا ہے۔

فکری سطح پر انہوں نے ایک نمایاں وار ان افلاطونی افکار پر کیا جنہوں نے مسلم تفکر کو بگاڑنے کی سعی کی تھی۔ اس زد میں تصوف بھی آیا اور شعر و ادبیات بھی لیکن اقبال کا بنیادی مؤقف یہ تھا کہ ہر نظریئے، ہر فن، ہر طریق کار غرض ہر شئے کو حیات بخش اور جماعت ساز ہونا چاہیے اور اس حیات بخشی اور جماعت سازی کی بنیادیں ایسی ہوں جو کہ ایک اجتماعی انسانی نصب العین کو پیدا کر سکیں۔ اقبال نے مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح اور روسو کی تحریک آزادی افکار جیسی مثبت تحریکوں کے گہرے مشاہدے و

مطالعہ اور ان تحریکوں کے بعض منفی اثرات کے حوالے سے یہ اخذ کیا کہ جب ہم برائی کو رد کرتے اور ناانصافی کی تکذیب کرتے ہیں تو یہ رد اور تکذیب اور نفی ہمیں مثبت بنیادوں پر ہی کرنی چاہیے۔ یہی روح ہے اقبال کی تنقید مغرب کی یعنی اس مخالفت اور رد کی تہہ میں جذبہ ہمدردی اور بہتری پیدا کرنے کا ہے۔ بایں ھمہ، یورپ کے حالات نے اقبال کو باور کرایا کہ فکری سطح پر دیکارٹ، مذہبی سطح پر لوتھر اور معاشرتی و سیاسی سطح پر روسو کے مثبت کام نے جس عمارت کی تعمیر کے لئے راستہ صاف کیا وہ بے بنیاد تھی۔ لہٰذا اقبال نے اپنی آنکھوں سے اس کی تخریب کو دیکھا اور اس کے انہدام کی مزید پیش گوئیاں بھی کیں۔

اپنے کلام میں اقبال تنقید مغرب کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہ تنقید تو اس تواتر اور شدت سے ہوتی ہے کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جیسا متوازن فکر اقبال شناس بھی یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کے رگ و پے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے[15]۔

ڈاکٹر موصوف کا یہ تاثر اس حد تک تو درست ہے کہ اقبال مغرب پر ضرب رسید کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایسا وہ مغرب کی خوبیوں کو نظر انداز کر کے کرتے ہیں۔ بال جبریل کے حوالے سے ان کی تنقید مغرب کے چند نمونے ملاحظہ کرتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں:

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں ۔۔۔ نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ!

یارب! یہ جہاں گزراں خوب ہے لیکن ۔۔۔ کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنر مند؟

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ ۔۔۔ دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند!

بسا اوقات یہ اصولی تنقید مغرب و مشرق دونوں پر محیط ہوتی ہے:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مے خانے ۔۔۔ یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا!

اور

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے ۔۔۔ مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الا

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے ۔۔۔ بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اور پھر یہ شعر

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی — مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

اور پھر ساتھ ہی اس اعتماد کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ:

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک — مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا!

پھر یہ شعر

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اور لندن میں لکھے گئے یہ شعر

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار — طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر!

پھر یہ شعر

وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن — پُرکار وسخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے!

پھر قرطبہ میں لکھے گئے یہ اشعار

یہ حوریان فرنگی، دل و نظر کا حجاب — بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا — مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب!

اور پھر یہ شعر

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی — کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

یہ دعا کہ

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر — مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری!

اور

خیرہ کر نہ سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ — سرمہ ہے مری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

پھر یہ شعر

مے خانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر!

اور

نہ کرا فرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے — کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

اور فرانس میں لکھے گئے یہ شعر

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام — وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام

پھر آگے چل کر جاوید کے نام لندن سے لکھتے ہیں کہ

اٹھا نہ شیشہ گراں فرنگ کے احساں — سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

بالِ جبریل کے آخر میں 'یورپ' عنوان کی نظم ہے اس میں لکھتے ہیں:

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار — جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح — دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

'ضربِ کلیم' میں 'مغربی تہذیب' کے زیرِ عنوان ملاحظہ کیجئے:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف!

ضربِ کلیم تو ہے ہی دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ۔ سو یہاں تنقید کا رنگ و آہنگ شدید ترین ہے۔ ضربِ کلیم میں سیاسیات مشرق و مغرب کا مستقل عنوان بھی قائم ہے۔ اس عنوان کے تحت کل سینتیس نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں سیاسیات مغرب کی حیلہ گری، انسانیت سوزی اور مکر و فریب کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اقبال فکر مغرب کی روش کو بدلنے کے لئے 'ضربِ کلیم' کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور اس کے لئے ان کا پیغام 'ضربِ کلیم' کے سرورق پر ہی رقم ہے کہ

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

تاہم تنقید مغرب کا مطالعہ کرتے وقت اقبال کا اشتراکی تحریک سے متعلق رویہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اشتراکیت کی تحریک کو بھی مغربی تمدن و سیاست کے خلاف ایک ردِ عمل خیال کرتے ہیں۔ وہ اشتراکی تحریک کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر نظر رکھتے ہیں۔

دراصل اشتراکی تحریک کے بارے میں اقبال کے مؤقف اور تاثر کو سرمایہ دارانہ نظام کے

بارے میں ان کے ردِعمل کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ سرمایہ دارانہ حکمت اور استدلال کو اقبال، قیصری، پرویزی، سلطانی، سرمایہ داری یا حکمتِ فرعونی قرار دیتے ہیں۔ اقبال اس حکمتِ فرعونی سے مایوس ہیں۔ اقبال کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہر آواز کو توجہ سے سنتے ہیں۔ پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء کو منظرِ عام پر آئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوئے چند ہی برس گزرے تھے۔ کسی بھی بڑے انقلاب کے تجزیئے، مطالعے اور اس پر تبصرے کے لئے چند برس کی کارگزاری ناکافی ہوتی ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام اور کلیسائی آمریت کے خلاف ایک مضبوط و مؤثر آواز اور تحریک کے طور پر اقبال اشتراکی انقلاب اور اس کے متعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے خاصا پُرجوش رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پیامِ مشرق کے حصہ 'نقشِ فرنگ' کی چند منظومات ہمیں بطورِ خاص متوجہ کرتی ہیں۔

پہلی نظم محاکمہ مابین حکیم فرانسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور ہے، اس میں فرانسیسی فلسفی بندہ مزدور کو باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ نظامِ عالم ایک فطری تقسیم کار کے مطابق چل رہا ہے۔ دماغ کا کام سوچنا، جبکہ پاؤں کا کام زمین پر گھسنا ہے۔ ایک اگر کام بتانے والا ہے تو دوسرا کام کرنے والا۔ اس تعلیم یا فلسفے پر مردِ مزدور کا ردِعمل بڑا شدید اور برملا ہے۔ وہ راضی برضا رہنے کی تعلیم کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ کوہکن کے مقابلے میں پرویز کو رد کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ کوہکن اگر محنت کا استعارہ ہے تو پرویز سرمایہ دارانہ نظام کی علامت۔ مزدور سرمایہ دار کو زمین کا بوجھ قرار دے کر کہتا ہے کہ اسے کھانے اور سوتے یعنی دوسروں کی محنت سے مزا اُڑانے کے سوا کوئی کام نہیں۔

بدوشِ زمیں بار، سرمایہ دار نداردگذشت از خور و خواب کار

اقبال اس نظم میں ''محنت'' کو ایک قدر کے طور پر اُجاگر کرتے ہوئے مردِ مزدور کی عظمت کو نمایاں کر رہے ہیں۔ پیامِ مشرق کے اس حصے میں ایک اور نظم بعنوان ''موسیو لینن اور قیصر ولیم'' بھی قابلِ توجہ ہے۔ یہاں لینن کہتا ہے کہ مدتیں گزر گئیں کہ آدم قیصر و کلیسا کے حلقۂ دام کا اس طرح سے اسیر ہے کہ جیسے دانہ تہِ سنگ ہو۔ یعنی گندم کا دانہ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہا ہو۔ لینن قیصر کو متوجہ کرتا ہے کہ اب اس غلام نے ردائے پیر کلیسا اور قبائے سلطان جلا دی ہے اور شرار آتش جمہور نے پرانے اور فرسودہ نظام کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں قیصر ولیم کا تبصرہ اس تاثر پر مبنی ہے کہ ''تاج گئی''

اگر عوام بھی پہن لیں تب بھی اس شہنشاہی و قیصری کے ہنگامے وہی رہتے ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ اقتدار کی ہوس اپنی غارت گری، صورت بدل کر بھی جاری رکھتی ہے۔ اس تاثر کو اقبال نے بال جبریل کی ایک غزل میں بڑے بلیغ انداز میں نظم کیا ہے

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا! طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

پیامِ مشرق کی نظم ''قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور'' تو اقبال کی اس موضوع پر دلچسپی کی ایک نہایت عمدہ مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ اقبال کی سیاسی و عمرانی فکر کا ایک اہم تر پہلو یہ ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام اور روش کو جملہ سیاسی و عمرانی مصائب کی جڑ خیال کرتے ہیں۔ ان کا اُردو فارسی کلام اسی سلطانی، پرویزی، قیصری اور فرعونی نظام کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ اپنی اس نظم میں اقبال نے سرمایہ دارانہ حیلہ گری اور حکمتِ فرعونی نظام کو بڑے سادہ اور دلچسپ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ سرمایہ دار بڑے معصومانہ انداز میں اپنے ''معاہدہ عمرانی'' کی لازمی شرائط بیان کر رہا ہے کہ دیکھو! آہن گری کے کارخانے کا شور شرابا میرے لئے اور کلیسا کے پیانو کی مدھر آواز تیرے لئے ہے، وہ درخت کہ جس پر حاکم ٹیکس لگاتا ہے میرا جبکہ باغ بہشت، سدرہ اور طوبیٰ تیرے لئے ہے۔ یہ تلخ پانی کہ جس سے سر میں درد ہو جاتا ہے میرا، جبکہ آدم و حوا کی شراب پاک تیرے لئے ہے۔ یہ مرغابی، تیتر اور کبوتر میرے لئے جبکہ ظلِ ھما اور شہپر عنقا تیرے لئے ہے غرض اس زمین پر اور اس کے پیٹ میں جو کچھ بھی ہے وہ میرا اور زمین سے لے کر عرشِ معلیٰ تک جو کچھ بھی ہے وہ تیرے لئے ہے۔ اس سے اگلی نظم نوائے مزدور میں مزدور اس معاہدہ عمرانی کو تار تار کرنے کے عزم کا اظہار کر رہا ہے۔ مزدور برملا اعلان کرتا ہے کہ اسے اپنے زیاں کا احساس اور شعور ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ناکردہ کار سرمایہ دار کا لباس حریر کھدر پوش محنت کش کی مشقت کا ثمر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کلیسا میرے خون کو چوس چوس کر جونک کی طرح پھولا ہوا ہے جبکہ دستِ سلطنت میرے ہی بازو کی قوت سے ہر شے پر متصرف ہے۔ یہاں مزدور شیشہ گداز شراب پیالے میں ڈالنے کا آرزومند ہے۔ وہ پرانے مے کدے کی بنیاد منہدم کر کے ساقی اور مے خانے کو نظام تازہ دینا چاہتا ہے۔ اسے یہ شعور بھی ہے کہ نظام تازہ کو ثبات دینے کے لئے رہزنانِ چمن سے گلِ لالہ کا انتقام لینا نہایت ضروری ہے۔

قیصر و کلیسا کی مذمت، مزدور و کسان کی عظمت اور محنت کی بطور ایک معاشی قدر اہمیت اور

فوقیت کا بیان اقبال کو اشتراکی ثابت نہیں کرتا۔ تاہم اشتراکیت کا بطور ایک سیاسی و معاشی تحریک کے مطالعہ اقبال کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ جاوید نامہ میں فلک عطارد کی منظومات کے عنوانات سے بھی اقبال کی اس موضوع سے حد درجہ دلچسپی کا اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ ''اشتراک وملوکیت'' کے زیرِ عنوان نظم میں اقبال نے اشتراکی فلسفے کی اساس مساوات شکم وملوکیت کی اساس بدن کی فربہی کے تناظر میں دونوں کو یزداں ناشناس اور آدم فریب نظام قرار دیا ہے۔ جاوید نامہ کے اس مقام پر پیغام افغانی باملتِ روسیہ، کو اشتراکیت کے بارے میں اقبال کے تاثر، تبصرے اور تجزیے کی کلید خیال کرنا چاہیے۔ ملتِ روسیہ کے نام اس پیغام میں اقبال ملت روسیہ کو لا سے آگے بڑھ کر الا تک آنے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس ملت کے کردار و عمل کو سراہتے ہیں اور ساتھ ہی اس ملت کو قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ یہاں اقبال جمال الدین افغانی کی زبانی قرآن کو جہاں ایک طرف سرمایہ دار کے لئے موت کا پیغام قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف قرآن کو دستگیر بندہ بے ساز و برگ کہتے ہوئے اشتراکیوں کو قرآن سے معنوی اور عملی اشتراک کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

اشتراکیت کے متعلق اقبال کا زاویۂ نگاہ سمجھنے کے لئے بال جبریل کی تین مسلسل نظموں کا مطالعہ بھی بے حد دلچسپ ہے۔ پہلی نظم ہے ''لینن خدا کے حضور'' ملاحظہ فرمایئے کہ اقبال نے کارل مارکس کے فلسفے کے شارح، کمیونزم کے بانی اور پہلی کمیونسٹ مملکت کے پہلے صدر کو خدا تعالیٰ کے حضور لا کھڑا کیا ہے۔ اس پوری نظم میں لینن بڑی دل سوزی کے ساتھ سرمایہ پرستی کے استبداد کی تفصیلات عرض کرتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نظام عالم کو جس قدر ''سرمایہ پرستی'' نے غارت کیا ہے اس قدر غارت گری کسی دوسرے نظام معاش کے حصے میں نہیں آئی اور آج بھی انسانیت جس بے رحم پیر تلے دبی سسک رہی ہے وہ سرمایہ پرستی ہی کا پاؤں ہے۔ لینن کے ساتھ اقبال کی ہمدردانہ دلچسپی کا باعث دونوں کا سرمایہ پرستی کے احوال و نتائج سے بیزار ہونا ہے۔ اقبال کی زبان سے لینن کی خدا کے حضور عرض داشت کے یہ مقامات دیکھیے:

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اوراس ساری عرض داشت کا محور لینن کا یہ سوال ہے کہ

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات!

اقبال اس دلچسپ، اثر انگیز اور معنی خیز نظم کے بعد فرشتوں کا گیت رقم کرتے ہیں۔ یہ پورا گیت پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

اوراس کے بعد اقبال ''فرمان خدا، فرشتوں سے'' رقم کرتے ہیں۔ یہ نظم اپنے رنگ و آہنگ کی شدت کے اعتبار سے بے حد معنی خیز ہے۔

فرمان خدا (فرشتوں سے)

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے
کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

اشتراکیت کی تحریک پر اقبال کے انتقاد میں حد درجہ شدت نہیں پائی جاتی لیکن اشتراکی تفکر کے ''لا'' کی منزل سے آگے بڑھ کر ''الا اللہ'' تک پہنچنے سے گریز نے اقبال کو باور کرادیا تھا کہ بالآخر یہ تحریک مغربی استعمار کے مقابل ایک مؤثر و متحارب قوت کے طور پر ٹھہر نہ پائے گی۔ ''ضربِ کلیم'' کی نظم ''لا و الا'' میں بھی اقبال اسی نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

نہادِ زندگی میں ابتداء لا انتہا الا ۔۔۔ پیام موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ!

وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی! ۔۔۔ یقین جانو ہوا لب ریز اس ملت کا پیمانہ!

اسی تناظر میں اقبال کو یقین ہو چلا تھا کہ بالآخر حتمی معرکہ مغربی استعمار کہ ڈاکٹر علی شریعتی جسے ''استعمار سفید'' کہتے ہیں اور اسلام کے مابین ہوگا ''ارمغانِ حجاز (اُردو) کی نظم'' ابلیس کی مجلس شوریٰ کا مرکزی نقطہ بھی یہی تصور ہے یعنی یہ کہ ''ابلیسی نظام'' کے لئے اصل خطرہ اشتراکیت نہیں، اسلام ہے۔ نظم میں شیطان کا تیسرا مشیر اسے کارل مارکس اور اس کی نظریاتی تحریک کی طرف متوجہ کرتا ہے:

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب! ۔۔۔ نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز ۔۔۔ مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روز حساب!

ابلیس کا پانچواں مشیر اسی تسلسل میں اپنے خدشات کا اظہار کرتا ہے:

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روح مزدک کا بروز ۔۔۔ ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہم سر شاہین و چرخ ۔۔۔ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار

یہی پانچواں مشیر اشتراکیت کی تحریک کو ابلیسی نظام کیلئے ''فتنۂ فردا'' خیال کرتے ہوئے فریاد کناں ہے:

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعت افلاک پر ۔۔۔ جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج ۔۔۔ کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے ۔۔۔ جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس اپنے مشیروں کو جواب دیتے ہوئے اشتراکی تحریک کے بارے میں ان کے ''خدشات'' کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے انہیں یقین دلاتا ہے کہ دست فطرت نے جن گریبانوں کو چاک کیا ہے وہ مزدکی منطق کی سوزن سے رفو ہونے والے نہیں، وہ بڑے فخر سے اپنے اس اعتماد کا اعلان کرتا ہے کہ

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد | یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

ابلیس اپنی مجلس شوریٰ کے روبرو ابلیسی نظام کے لئے اشتراکیت کی بجائے اسلام کو فتنہ فردا قرار دیتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے | جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے | مزدکیت فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے

ابلیس اپنے مشیروں کو متوجہ کرتا ہے کہ ہر چند امت مسلمہ حامل قرآن نہیں رہی، بندہ مومن نے بھی سرمایہ داری کو اپنا دین بنا رکھا ہے، مشرق کی تاریک فضاؤں میں پیران حرم کی آستینیں ید بیضا سے محروم ہیں لیکن پھر بھی ابلیس متوجہ کرتا ہے کہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے یہ خوف بڑھتا جا رہا ہے۔ شرح پیغمبر ﷺ آشکارا نہ ہو جائے۔ پھر وہ اس تصور ہی سے مضطرب ہو کر چیختا ہے:

الحذر آئین پیغمبرؑ سے سو بار الحذر | حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

اس اضطراری چیخ کے بعد ابلیس آئین پیغمبر ﷺ کی چار نمایاں خوبیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اول: ہر طرح کی غلامی کا انقطاع

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے

دوم: مساوات

نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں

سوم: دولت کی منصفانہ تقسیم، سود کی ممانعت

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف | منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

چہارم: زمین اللہ کی ملکیت ہے

ان خوبیوں کے بیان کے بعد ابلیس اپنے مشیروں کو اس امت کو خوابیدہ اور غافل رکھنے کے قریباً سترہ طریقے بتاتا ہے۔ اس کا اپنے مشیروں کے لئے فرمان یہ ہے:

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے | یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اور یہ کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے | پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

دراصل اقبال کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اشتراکیت کا انقلاب ملوکیت اور سرمایہ دارانہ استبداد کا خاتمہ تو کردے گا لیکن خود اشتراکیت کو استبداد میں تبدیل ہونے سے کون بچا سکے گا۔ انہوں نے اشتراکی انقلاب کو فرسودہ طریقوں سے زمانے کے بیزاری سے تعبیر کیا[16]۔ اور اس کے کلیساؤں کے لات و منات توڑ ڈالنے والے کردار کو سراہا[17] لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو قرآن میں غوطہ زن ہونے کی دعوت بھی دی۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

یہاں قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ اقبال مجموعی طور پر اشتراکیت و ملوکیت دونوں سے متعدد وجوہ کی بناء پر مایوس نظر آتے ہیں۔ وہ ''جاوید نامہ'' کی نظم ''اشتراکیت و ملوکیت'' میں دونوں سے بیزاری کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج!
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل!

اقبال سیاسیاتِ افرنگ پر کڑا انتقاد کرتے ہوئے اس پورے نظام کو ابلیسی قرار دے کر ناقص ٹھہراتے ہیں۔

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(سیاستِ فرنگ)

فکرِ افرنگ کو ابلیسی قرار دے کر ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام بھی رقم کیا ہے۔

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

افغانستان کے بارے میں ابلیس کا یہ فرمان دیکھئے:

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

امریکا جو اس وقت مغربی تمدن و ثقافت کا بزعم خود نمائندہ ہے اور اپنے طرزِ زندگی کو محفوظ و مامون بنانے کے لئے مسلم دنیا پر اپنے پے در پے محاربوں کا آغاز کر چکا ہے تو اس نے یہ آغاز بھی خانہ جنگیوں کے ستائے ہوئے ایک ایسے مسلمان ملک سے کیا جس کا واحد قصور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے

سادہ سید ھے اور قدرے اکھڑ مزاج لوگ ملا کے سکھائے اور بتائے ہوئے اسلام پر من وعن عمل کرتے ہوئے اپنے لئے ایک طرزِ زندگی تشکیل دینے کی سعی کر رہے تھے۔ اگر چہ افغانستان کے علماء کا تصور دین مقامی رسم و رواج کے دباؤ سے آزادی حاصل نہیں کر پار ہا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی آزادی کے لئے بڑا وقت اور دانش صرف ہوتی ہے۔ افغانستان کے روایتی ملاؤں کے پاس نہ تو ایسی تعلیم و تربیت اور فہم و دانش تھی اور نہ ہی وقت کیوں کہ ''ابلیسی نظام'' نے انہیں بالواسطہ حکمت عملی سے وقت کی ایک بند سرنگ میں گھیر لیا تھا۔ ایسے میں مزاج خانقاہی میں تبدیلی آنا ممکن نہ تھا۔ ان سادہ دلوں کو فوری حملے کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے بعد عراق میں عربوں کو نشانہ بنایا گیا اور اب ایران کی طرف دیکھا جا رہا ہے۔ مغربی اقوام کی جنگجو یانہ منطق وسیع بربادی برپا کرنے والے اسلحہ کی دلیل اور ہر اس طرز زندگی کو مٹا دینے کی آرزو جسے وہ اپنے لئے خطرناک تصور کر لیں (اور اس کے لئے انہوں نے دہشت گردی کی اصطلاح وضع کی ہے) اپنی کارگزاری دکھا رہی ہے۔ اقوام مغرب کے اس طرزِ عمل نے اس سوال کو دنیا کا سب سے بڑا سوال بنا کر رکھ دیا ہے کہ ''کیا بے پناہ طاقت کو کسی آفاقی اخلاقی نظم وضبط کا پابند ہونا چاہیے؟''

اقوام مغرب کا فیصلہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں۔ بے پناہ طاقت کے لئے اخلاقی نظم وضبط کی آنکھ بے معنی ہے۔ طاقت کا دیو دماغ سے نہیں اپنے شکم سے سوچتا، اپنی حرص سے فیصلے کرتا اور اپنی بے مہار جبلت کے مظاہر کو انصاف کا نام دے ڈالتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے اپنی تو تشکیل لغت میں اندھے انتقام کا نام انصاف رکھا ہے اور وہ مصر ہیں کہ اس انصاف کا مظاہرہ وہ دنیا بھر کے مسلم ممالک میں کر کے ہی دم لیں گے۔ تہذیبوں کا طالب علم حیرت سے پاگل ہوا جاتا ہے جب وہ اکیسویں صدی کے آغاز میں انسان کا وہی طرزِ عمل دیکھتا ہے جو پتھر کے زمانے میں تھا یعنی طاقتور کا اضطراری عمل ورد عمل ہی انصاف ہے۔ طاقتور جس شیے سے خطرہ محسوس کرے اسے تہس نہس کر دے، جس شئے کی ضرورت محسوس کرے اسے اپنے تصرف میں لے آئے اور جس شے کو بے ضرورت خیال کرے اسے تہہ و بالا کر دے۔

اس سوال کا جواب کون دے گا کہ مغرب صدیوں کے سفر کے بعد جب کہ شاندار فتوحات کا زریں تاج اس کے سر پر چمک رہا ہے اپنی روح سے لے کر اپنے عمل تک آج بھی اسی قدر وحشی، بے رحم اور سفاک ہے جس قدر صدیوں پہلے تھا۔ کیا وجہ ہے کہ مغرب کا انسان اپنے اندر کی سفاکی، بے رحمی، اور خود غرضی کو فتح کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا؟

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (۱۹۳۶ء) میں تو اقبال کی تنقید مغرب انتہائی شدید ہے۔ مثنوی کے مرکزی موضوع میں اقبال مغربی اقوام کے خود غرضانہ، جنگجویانہ اور اسلحہ بند طرزِ عمل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اقوامِ مشرق کو بیدار ہونے اور بے حسی و بے عملی ترک کرنے کا درس دیتے ہیں۔

آدمیت زار نالید از فرنگ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق باز روشن می شود ایام شرق

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

علم اشیاء خاک مارا کیمیاست آہ! در افرنگ تاثیرش جداست

عقل و فکرش بے عیار خوب و زشت چشم او بے غم دل او سنگ و خشت

دانش افرنگیاں تیغے بدوش در ہلاک نوع انسان سخت کوش[۱۸]

حواشی

۱۔ اسلام اور علوم جدیدہ کے موضوع پر محمڈن ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ دہلی، ۱۹۱۱ء میں اقبال کی صدارتی تقریر اس موضوع کی بہترین وضاحت کرتی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ یورپ کی ترقیوں کی بنیاد دراصل مسلمانوں ہی کے علوم ہیں۔ مقالات اقبال، ص ۱۸۰

۲۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۰۶

۳۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۰۷

۴۔ شذرات فکر اقبال، ص ۶۵

۵۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۰۵

۶۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۰۵

۷۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۱۸

۸۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۷۱

۹۔ ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ، ص ۳۹۔۳۸

۱۰۔ دیباچہ مثنوی اسرار خودی، مقالات اقبال، ص ۱۹۷

۱۱۔ فکر اقبال، ص ۱۷۷ اور ۱۸۷۔۱۸۶

۱۲۔ حرف اقبال، ص ۲۱۹۔۲۱۸۔۲۱۷

۱۳۔ فکر اقبال، ص ۵۳۔۵۲

۱۴۔ خط بنام وحید احمد مسعود مدیر نقیب بدایوں، محررہ ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء مشمولہ کلیات مکاتیب اقبال (جلد دوم)، ص ۲۷۱، مرتبہ مظفر حسین برنی۔

۱۵۔ فکر اقبال، ص ۱۶۰

۱۶۔ نظم اشتراکیت، ضرب کلیم

۱۷۔ نظم بلشویک روس، ضرب کلیم

۱۸۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ۵۷۔۵۶

ثمر بانو ہاشمی

جنابِ فاطمہ زہراؑ ۔ تاریخ وتہذیب کے آئینے میں

''سیرت الفاطمہ'' میں سید ذاکر حسین لکھتے ہیں ''القاب حضرت کے بکثرت ہیں جن کا شمار ہی ممکن نہیں ۔ آپ فاطمہ ہیں' زہرا ہیں' عذرا ہیں' ام الحسنین ہیں' ام الائمہ ہیں' سیدہ النساء ہیں' افضل النساء ہیں' مریم الکبریٰ ہیں' مبارکہ ہیں' طاہرہ ہیں' مرضیہ ہیں' محدثہ ہیں' زاکیہ ہیں'' اس کے بعد ۴۹ القاب درج کیے ہیں ۔ جناب فاطمہ کے مناقب کی تفصیل کو قلم دامن قرطاس میں نہیں سمیٹ سکتا ۔ احادیث کی کتب پڑھ جایئے ۔ بے شمار مورخین کی مصدقہ روایات کا مطالعہ کیجئے ۔ قرآن حکمت کی آیات بیّنات کو دیدہ ودل سے گذاریے مناقب کا احاطہ ممکن نہیں ہے ۔

سورۂ احزاب کی آیہ تطہیر ملاحظہ کیجئے:

انما یریداللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا ۔

(اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے رجس (ناپاکی) دور کردے اور تمہیں پوری طرح پاک صاف کردے)

انس بن مالک سے روایت ہے کہ آیہ تطہیر کے نزول کے بعد رسولؐ اللہ کا چھ مہینے تک یہ معمول رہا کہ صبح نماز فجر کیلئے نکلتے وقت سیدہ کے دروازے پر جا کر پکارتے (اہل بیت نماز پڑھو ۔ اور پھر آیہ تطہیر تلاوت فرماتے) بحوالہ جامع ترمذی

ارشاد رسول یہ ہے:

''فاطمہ بغمتہ منی فمن اغضبا فقہ اغضبنی'' (صحیح بخاری)

آپ نے فرمایا ''فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھ کو اذیت دی ۔''

آپ نے فرمایا: **''سیدۃ النساء اھل الجنۃ''** (فاطمہ اہل جنت کی خواتین کی سردار ہیں)

(البدایہ والنہایہ ۔ حافظ ابن کثیر)

نیز فرمایا: ''تمہاری تقلید کیلئے تمام دنیا کی عورتو! مریم' خدیجہ' آسیہ اور فاطمہ کافی ہیں''

(ترمذی کتاب المناقف)

''فاطمہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہونگی'' (کنز العمال)

''فاطمہ سیدۃ النساء العالمین''

(فاطمہ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہیں) (الاصابہ۔ حافظ بن حجر)

امام دیلمی لکھتے ہیں (حدیث رسولؐ)

''میں نے اپنی بیٹی فاطمہ کا نام فاطمہ اس وجہ سے رکھا ہے کہ خدا سبحانہ تعالیٰ نے اس کو اور اس کے دوست داروں کو آتشِ دوزخ سے نجات دی ہے۔'' ابن مسعود سے حدیث رسولؐ منقول ہے۔'' فاطمہ نے گناہوں سے اپنے نفس کو بچایا۔ پس اللہ نے اس پر اور اس کی اولاد پر آتش دوزخ کو حرام کر دیا۔''

اس سے پہلے کہ ہم سیرت فاطمہ الزہرہ کے مختلف پہلوؤں پر بات آگے بڑھائیں حکیم الامت' حضرت علامہ اقبال کی ایک معروف نظم سے چند اشعار یہاں پیش کر دیں تا کہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ سیدہ کے فضائل کا بیان اس قادر الکلام شاعر کے حد تصور سے اور احاطۂ بیان سے باہر ہے۔

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز
نورِ چشم رحمۃ اللعالمیں — آں امامِ اولین و آخریں
بانوے آں تاجدار ہل اتیٰ — مرتضیٰ' مشکل کشا' شیر خدا
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق — مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول — مادراں را اسوہ کامل بتول
آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گردان و لب قرآں سرا

انیس اشعار کی یہ نظم عقیدت کے انتہائی حیرت انگیز موڑ پر ختم ہوتی ہے۔

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست — پاسِ فرمانِ رسولِ مصطفیٰ ست
ورنہ گردِ تربتش گردیدمی — سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمی

(کیا کروں آئین حق قدموں کی زنجیر بنا ہوا ہے اور جناب مصطفیٰؐ کے فرمان کا پاس ہے (ورنہ اگر) قرآن و شریعت مانع نہ ہوتے تو میں جناب فاطمہ کی تربتِ اقدس کا طواف کرتا اور اس خاک پاک پر اپنے سجدے نچھاور کرتا۔)

جناب سیدہ حقیقت میں ایک ایسی معجزاتی شخصیت ہیں جو دنیائے اسلام اور عالم انسانیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ قدرت نے اپنی حکمت بالغہ سے انہیں ارفع مقاصد کیلئے پیدا فرمایا اور انہیں ایسی سیرت عظیم سے نوازا اور کردار کے ایسے نورانی سانچے میں ڈھالا کہ وہ تہذیب انسانی کا مرکز و محور بن گئیں۔

امامت ان کے آغوش تربیت میں پلی' انسانیت ان کے دامان ہدایت میں مہذب ہوئی' ان کا ہر عمل انسانوں کے ہر طبقے کیلئے ایک نقش رہنمائی بن کر ابھرا۔ خصوصاً طبقہ نسواں نے ان کی ہر ادائے سیرت سے جینے کے آداب سیکھے اور معاشرے میں اپنے حقوق اور اپنی حیثیت کے تحفظ کا چلن سیکھا۔ خود داری وغیرت' صبر وتحمل' استقلال اور ثابت قدمی' اطاعت اور وفا کیشی' عبادت وریاضت اور عفت وحیا کے جتنے اجالے دنیا میں پھیلے ان کا سرچشمہ انہی کی ذات گرامی ہے۔ جناب سیدہ ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئیں جو معاشرہ بیٹی کو احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ ایک نفرت انگیز فضا میں ''دختر کشی'' کا سنگدلانہ ماحول وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب اور اقوام میں بھی عورت کا کیا مقام تھا؟ وہ جانور سے بھی بدتر تھی وہ کنیز تھی' بے حرمت تھی' دنیا کی حقیر ترین شے تھی' اور عرب کے جاہل معاشرے میں اس کی تحقیر اس کی ذلت کے آخری نقطے تک جا پہنچی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکی کو زندہ دفن کر دیا جاتا' یہ عرب معاشرے کا ایک مخصوص مزاج تھا جو ان کے بدوی اور صحرائی ماحول میں منطقی نتیجہ تھا۔ اس معاشرے میں بیٹے ہی کی اہمیت تھی جو ان کی زندگی کا محافظ اور انکی عظمت وطاقت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں لڑکی کا پیدا ہونا حقارت کا سبب خیال کیا جاتا۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بیٹی کیلئے بہترین رشتہ قبر اور صرف قبر ہے۔ ایک تصور یہ بھی ہے کہ جاہلی عرب میں لڑکیوں سے نفرت کا بنیادی سبب اقتصادی مسائل ہیں۔ یعنی لڑکی ایک بوجھ سمجھی جاتی تھی۔ بہرحال یہ معاشی مسئلہ ہو یا احمقانہ غیرت مندی' لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم چل پڑی تھی۔ عورت سے حقارت کا سلوک عام تھا۔ ایسے عجیب و غریب ماحول میں رسولؐ خدا کے یہاں جو بیٹے پیدا ہوتے ہیں بچپن میں ہی مرجاتے ہیں۔ آخر میں ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے جس سے حضور کی نسل چلتی ہے۔ عرب میں اُس شخص کو جو اولاد نرینہ سے محروم ہو' ابتر'' کہتے تھے۔ سورہ الکوثر نے اس جاہلانہ عقیدے کو بھی باطل کر دیا بلکہ دشمن رسول کو جو دس بیٹوں کا باپ ہے ''ابتر'' قرار دیا۔ اور رسولؐ پاک کو کوثر یعنی خیر وبرکت کی کثرت اور نسل کی کثرت سے منسوب کیا۔ دختر

رسولؐ سے جو نسل چلی اس میں خدا نے کیسی کیسی خیر و برکت کی کثرتیں رکھ دیں۔ اس تمام تناظر میں جناب سیدہ کا وجود عرب میں بلکہ دنیائے انسانیت میں ایک فکری انقلاب کی بنیاد ہے۔

جناب فاطمہ زہرا خانوادہ رسالت کی تنہا وارث ہیں۔ اس خاندان کی عزت، بزرگی، اقدار، سب کی اکیلی محافظ، یہ حیرت انگیز تاریخی صداقت ہے کہ ایک باپ جو نبیؐ ہے، سردارِ انبیاء ہے، سرورِ حیات و کائنات ہے۔ اپنی بیٹی کا ہر موقع پر نہایت احترام کرتا ہے کیا یہ صرف بیٹی کا احترام ہے؟ نہیں یہ بیٹی کے پردے میں سیدۂ کائنات کی عزت ہے، خواتین عالم کی سرداری کی عزت ہے۔ نبیؐ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے، وہ جس شخصیت کی آمد پر کھڑے ہو کر استقبال کرتا ہے وہ بیٹی ضرور ہے لیکن وہ حیات و کائنات میں پیدا ہونے والے تہذیبی انقلاب کی سربراہ ہے۔ عرب کے فرزند پرست اور دختر کش ماحول میں نبیؐ کا یہ عمل عقائد پر ضرب کاری ہے۔ پیغمبرؐ صبح کو کھڑکی کھولتے ہیں اور بیٹی کو سلام کرتے ہیں۔ سفر پر جاتے ہیں تو گھر جا کر خدا حافظ کہتے ہیں۔ سفر سے لوٹتے ہیں تو سب سے پہلے بیٹی سے ملتے ہیں۔ عموماً بیٹی کے ہاتھوں اور چہرے کو بوسہ دیتے ہیں۔

نبوت کا اصل مقصد تبلیغ اسلام تھا۔ تاریخ اسلام کے صفحات ان واقعات سے پر ہیں جس میں نبیؐ کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹی فاطمہ بھی ان آزمائشوں اور آلام سے گذریں جو خود حضور کو پیش آئے۔ نبیؐ کا گھرانہ فقر، سادگی اور افلاس کی برکتوں سے پر ہے۔ مادی شان و شوکت اور دنیوی جاہ و جلال کا اس طرف گذر نہیں۔ اس مخصوص فضا میں پرورش پانے والی فاطمہ ایک اولوالعزم مخدومہ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہیں اور امت مسلمہ کیلئے ایک ابدی منشور مرتب کرتی ہیں۔ اس موقع پر مناسب ہو گا کہ مختلف مواقع کی مناسبت سے چند لائق تقلید مثالیں پیش کی جائیں۔ آپ کا نکاح سادگی کی ایسی مثال ہے جو انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ شہنشاہِ انبیاء، سلطانؐ کونین کی بیٹی کی شادی کس سادگی سے ہوتی ہے۔ مولا علی سرورؐ کائنات سے فاطمہ سے عقد کی درخواست کرتے ہیں (نہج البلاغہ) تذکرہ ابوتراب میں تحریر ہے کہ آپؐ نے پوچھا ''علی تمہارے پاس مہر ادا کرنے کیلئے کچھ ہے؟'' عرض کی ''ایک گھوڑا اور ایک زرہ کے سوا کچھ نہیں ہے'' آپؐ نے فرمایا ''گھوڑا تو لڑائی کیلئے ہے۔ البتہ زرہ فروخت کر دو۔'' حضرت علی نے زرہ کو حضرت عثمان کے پاس چار درہم میں بیچا اور قیمت لا کر آنحضرتؐ کے سامنے پیش کر دی۔ آپؐ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ بازار سے عطر اور خوشبو خرید لائیں۔ خود حضور نے نکاح پڑھایا اور

دونوں میاں بیوی پر وضو کا پانی چھڑک کر خیر و برکت کی دعا دی۔ سیدہ کو جو جہیز ملا تھا اس کی کل کائنات یہ تھی: ایک پلنگ' ایک بستر' ایک چادر' دو چکیاں اور ایک مشکیزہ' عجیب اتفاق ہے کہ یہی چیزیں حضرت فاطمہ کی زندگی تک ان کی رفیق رہیں اور حضرت علی اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

اس واقعہ کو فوق بلگرامی اپنی معروف تصنیف ''الزہرا'' میں لکھتے ہیں ''عسرت و ناداری اور غیرت و افلاس کی دولت آپ اپنے گھر سے گویا جہیز میں ساتھ لائی تھیں۔ یہی دولت افلاس اپنے شوہر ذی وقار کے گھر میں ملی تو کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔'' رسالہ سیرت زہرا'' میں ایک عبرت آموز واقعہ ملتا ہے۔ ایک روز نماز ادا کرنے کے بعد مصلے پر تشریف فرما تھیں۔ بھوک سے نڈھال اور غمزدہ' سر کی چادر میں پچیس پیوند' رسولؐ خدا تشریف لاتے ہیں۔ بیٹی کو نڈھال دیکھ کر ماجرا پوچھتے ہیں سیدہ فرماتی ہیں' یونہی اپنے افلاس و غربت کا خیال آ گیا تھا۔''

آپؐ نے فرمایا فاطمہ اپنے مصلے کا ایک گوشہ تو الٹو' تعمیل ارشاد کی' کیا دیکھتی ہیں کہ اس کے نیچے ایک نہر چاندی کی' ایک سونے کی جاری ہے۔ آپؐ نے فرمایا'' جتنا سونا چاندی چاہے لے لو خوب راحت کی زندگی گذارو لیکن خوب سوچ لو کہ یہ آرام دنیا صرف چند روزہ ہے۔ یا دنیا لے لو یا عقبیٰ''

بیٹی نے بے نیازی سے جواب دیا'' مجھے دنیا کی دولت کی ضرورت نہیں'' یہ کہہ کر اپنے مصلے کا گوشہ سیدھا کر دیا۔ سید نجم الحسن 'چودہ ستارے' میں تحریر فرماتے ہیں شوہر کے گھر جانے کے بعد آپ نے جس نظام زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے وہ طبقہ نسواں کیلئے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ گھر کا تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتیں' جھاڑو دینا' کھانا پکانا' چرخہ چلانا' چکی پیسنا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا روز کا معمول تھا۔ اکیلی سب کام انجام دیتیں۔ صرف ایک بار ے ہجری میں پیغمبرؐ خدا نے ایک خادمہ عطا کی جو فضہ کے نام سے مشہور ہیں تو رسولؐ خدا کی ہدایت کے مطابق ایک دن گھر کا کام خود کرتی تھیں اور ایک دن فضہ سے کام لیتی تھیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی نے ساری رات ایک باغ سینچا اور بطور اجرت تھوڑے سے جَو حاصل کئے۔ سیدۂ عالم نے کچھ جَو لئے' آٹا پیسا' روٹیاں تیار کیں۔ ایک مسکین نے در پر صدا دی'' میں بھوکا ہوں'' آپ نے تمام روٹیاں اٹھا کر اسے دے دیں۔ پھر آٹا پیس کر روٹیاں تیار کیں اور ایک یتیم کی صدا پر وہ روٹیاں اسے عنایت کیں۔ تیسری بار ایک قیدی نے دست

سوال دراز کیا اسے بھی نوازا گیا اور اس دن اہل خانہ فاقہ سے رہے' اللہ تعالیٰ کو یہ ادا اس قدر بھائی کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

"وَیطعمون الطعام علیٰ حبّہ مسکیناً ویتیماً واَسیرا" (سورہ الدھر)

(اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین' یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

صبر و تحمل کی یہ شاندار مثال ایک طرف' دوسری طرف عبادات' رات عبادت میں اور دن روزے میں گذرتا۔ تلاوت قرآن فرماتیں تو رقت طاری ہو جاتی' بعض اوقات عبادت کرتے وقت اتنے آنسو بہتے کہ مصلیٰ بھیگ جاتا۔ اس کیفیت کو اقبال نے اس طرح اشعار کا جامہ پہنایا' اردو ترجمہ:

"وہ اپنے آنسوؤں کے موتی جانماز پر گرایا کرتی تھیں۔ ان کے آنسو جبریل امین زمین سے چنتے تھے اور قطرات شبنم کی طرح آسمان پر بکھیر دیتے تھے۔"

سیدہ زہرا نے عورتوں کی معراج پردہ داری کو بتایا اور خود ہمیشہ اسی پر عامل رہیں۔ یہاں تک کہ کبھی اپنے والدؐ محترم کے پیچھے نماز جماعت میں شرکت یا وعظ سننے کیلئے بھی مسجد تشریف نہیں لائیں۔ اسی شرم و حیا کی بنا پر اپنی وفات سے پہلے وصیت کی کہ میرے جنازے پر کھجور کی شاخوں کے کپڑے کا پردہ ڈال دیا جائے اور جنازہ رات کے وقت اٹھایا جائے۔ اسی حجاب کے پیش نظر اقبال نے حجاب کو تربیت اولاد کی اساس قرار دیا ہے کہ جب ماں عصمت و طہارت کے اس بلند مقام پر ہو گی تو اس کی آغوش میں پلنے والی اولاد اخلاق کی کس بلند منزل پر ہو گی؟

اگر بندی زدرویشی پذیری — ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولی باش و پنہاں شوازیں عصر — کہ در آغوش شبیری بگیری

اگرچہ سیدہ کی تمام عمر مصائب و آلام میں گزری لیکن رسولِ خدا کی وفات کے بعد ایسی ایسی آزمائشوں سے گذرنا پڑا اور مصیبتوں کے ایسے پہاڑ ٹوٹے کہ اگر یہ مصائب کسی پہاڑ پر ٹوٹتے تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

آپؐ کے وصال کے بعد فاطمہ بہت کم زندہ رہیں۔ آخر تقریباً ڈھائی تین ماہ بعد وفات پا گئیں۔ تمام آئمہ میں جتنے اوصاف ہیں ان کا اولین سرچشمہ نبیؐ' علی اور فاطمہ ہیں۔ خصوصاً جناب فاطمہ کہ وہ اپنے والدؐ کی صفات کی واحد وارث ہیں۔ کربلا جناب فاطمہ ہی کی سیرت طیبہ کے جلوؤں سے آباد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی میں خود ایک کربلا وجود پا رہی ہے اور وہ حسنین کو اور جناب زینب کو

ایک آنے والی کربلا کیلئے تیار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اپنے بیٹوں کی جبیں پر حرف غیرت لکھ دیا۔ ''اولیں سطرِ کتاب کربلا ہیں سیدہ''

کربلا میں راہ حق میں جانیں قربان کرنے والے غازی اور شہید سیدہ ہی کی براہ راست اور بالواسطہ تربیت کی مثالیں ہیں۔ حسنین کا بیعت یزید سے انکار' عباس علمدار کی بے مثال وفا' دربار شام میں جناب زینت کا جرأت مندانہ خطاب' سیدہ کی تربیت ہی کا نتیجہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہر عہد اور ہر دور کے مسائل و مصائب کا حل فاطمہ کی سیرت کی تقلید میں ہے۔ خصوصاً آج کے مضطرب اور منتشر مادی دور میں فاطمہ کی سیرت ایک منشور ہدایت ہے۔ وہ ایک سنگ میل ہیں بلکہ مشعل ہدایت اور منزل مقصود ہیں۔ آج خواتین جن مادی اور ذہنی مسائل کا شکار ہیں' سیرت فاطمہ ان تمام مسائل کا حل ہے۔ بے پردگی نے حرمت اقدار کو جس بری طرح پامال کیا ہے ان کا سدباب فاطمہ کا حجاب ہے۔ آج عورت اپنے معاشرتی حقوق میں جس افراط و تفریط کا شکار ہے بلکہ مغربی زندگی نے اسے مادرانہ فرائض ادا کرنے سے باغی بنا دیا ہے۔ اس کا مداوا صرف فاطمہ کے تقدس اور تقوی میں ملتا ہے۔ آج مسلمانان عالم جہیز کی شکل میں جس اسراف سے دوچار ہیں' دکھاوے اور ریاکاری کی زندگی نے ہمیں تباہی کے جس دھانے پر لا کھڑا کیا ہے اس کا بہترین حل فاطمہ کی سادگی اور قناعت کا ماحول' ایک باوقار' باعظمت' زندگی بسر کرنے کا رویہ ان دکھوں کا دائمی علاج ہے۔

ہمارا قومی لباس اور قومی زبان ہمارے تشخص کے ضامن ہیں

ڈاکٹر مظہر حامد

پروفیسر منظور حسین شور۔ انسانی اقدار کا شاعر

شور علیگ ☆ ۱۹۱۴ء کو امراوتی ناگپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ناگپور میں حاصل کی۔ میٹرک اور انٹر امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ پرائمری تعلیم کے دوران ایک واقعہ ایسا رونما ہوا جسے اپنے آخری ایام میں یہ کہہ کر سنایا کہ یہ واقعہ میں نے آج تک کسی کو نہیں سنایا۔ لو مظہر میاں سنو!

''ایک دن میری والدہ صاحبہ نے کھانے کا ٹفن تیار کیا اور میری انگلی پکڑ کو حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے پاس پہنچیں کھانا بابا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ بابا صاحب نے کھانے میں ہمیں بھی شریک کر لیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بابا صاحب سرکنڈے کا قلم تراش کر لائے اور مجھے دیتے ہوئے فرمایا۔'' جاتا بابا لکھتا پڑھتا جاتا بابا بہت پڑھتا''

بابا صاحب کے یہ دعائیہ کلمات تعلیمی سفر میں اسم اعظم کا کام دیتے رہے، اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی) ایم اے (انگریزی) کی اسناد حاصل کیں۔ ناگپور سے ایل ایل بی کے امتحان میں کامیاب ہوئے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ برصغیر کی مشہور جامعات اور مختلف کالجوں میں پروفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ ناگپور یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن، گورنمنٹ کالج لائلپور اور گجرات (پنجاب) اور آخر میں جامعہ کراچی سے ۱۹۸۴ء میں شور صاحب ریٹائر ہوئے اس دورانیے میں متعدد شعری مجموعے منصۂ شہود پر آئے۔

''فیض دوراں''، ''دیوار ابد''، ''سواد سیم تناں''، ''صلیب انقلاب''، ''ذہن وضمیر'' (رباعیات) اور ''میرے معبود'' طویل نظم ناگپور سے شائع ہوئی۔ غیر مطبوعہ نگارشات میں ''اندر کا آدمی'' نفسیاتی مضامین۔ یہ مضامین ''الشجاع'' میں بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ ''حشر مرتب'' (غزلیات)

☆ عظیم شاعر پروفیسر شور (مرحوم) کی شہرت کا آغاز وارتقا ''شور علیگ'' کے نام سے ہوا البتہ بعد میں (لائلپور کے قیام کے دوران) انہوں نے ''پروفیسر منظور حسین شور'' ہی لکھنا اور منسوب کیا جانا پسند فرمایا (ادارہ)

''اعصار وافکار''، تنقیدی مضامین ''انگشتِ نیل پر'' ابھی تک اشاعت کے لمس سے آشنا نہ ہوسکیں۔شور علیگ ایک وضع دار اور خود دار شخصیت کے مالک تھے انہوں نے ایسے دور میں آنکھ کھولی جب پہلی جنگ عظیم اپنے اختتام پر پہنچ چکی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ان ہولناکیوں کے باعث انسانی اقدار تقریباً ختم ہوچکی تھیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال جیسی نابغہء روزگار شخصیتیں اپنے اپنے علم اور افکار سے توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ادب اور زندگی کو یکجا کرنے میں ترقی پسند تحریک کا نمایاں کردار ہے شور نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ تعلیم کے دوران علی گڑھ کے مشاعرے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔اس شعری فضا اور ماحول نے انہیں نظم کی طرف متوجہ کیا شاعروں میں جاں نثار اختر، مجاز لکھنوی، اختر الایمان، علی سردار جعفری جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی جیسے اساتذہ فن اپنا جادو جگا رہے تھے۔انہی میں ایک آواز شور علیگ کی ابھری شور نے اپنی نظموں میں انسان کو موضوع سخن بنایا۔انسانی اقدار اور اس کے وقار کو اجاگر کیا۔ جوش وجگر سے بہت زیادہ متاثر تھے لیکن علامہ اقبالؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے شور کی نظموں میں اقبال کے اثرات نمایاں نظر آتے تھے ان کی فکر موضوعات کے اعتبار سے اقبال سے بہت زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ عالمگیر انسانیت، سماج، انقلاب اور رومان و جمالیات پر جاندار نظمیں لکھیں۔مشرق ومغرب کے ادب اور فلسفے نے بھی ان کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔

شور کی فکر کو کسی ایک زاویہ سے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ انکی شاعری تہہ در تہہ پہلو لئے ہوئے ہے۔ان کی نظموں میں تاریخی پس منظر اور پیش منظر کے علاوہ ادبی رچاؤ اور فن پر گرفت نہایت مضبوط ہے۔نظم اور نثر دونوں میں وہ امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ شور حال ہی کا نہیں مستقبل کا بھی شاعر ہے۔

ان کی نظموں میں عصری گونج، جذباتی ردِّعمل اور خود اعتمادی کا جو اظہار ہمیں ملتا ہے وہ داخلی اور خارجی احساسات ہیں یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت وہ انسان کو متحرک اور انسانی اقدار و وقار کو فعال بناتے ہیں۔انہوں نے اپنے عہد کے تضاد کو بڑی خوبصورتی سے نظموں میں پیش کیا ہے عہد نو میں ہنگامی صورتحال مختلف تحریکیں، معاشرتی، سماجی مسائل حزن اور یاسیت کی صحیح تصویر کھینچ کر ان کی نشاندہی حسین پیرائے میں کی ہے۔شور کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع مشاہدہ عمیق،

تجربات متنوع اور فکر و تخیل کی پرواز بلند ہے نظموں میں نوحے اور نغمگی کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی ہے۔

رعنائی خیال، لطافت افکار، طرز ادا کی ندرت ذہنی افق کی کشادگی اور سحر انگیزی معجزاتی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے، وہ نباض وقت تھے جس نے اپنے دور کے حالات و واقعات اور تضادات کو شدت سے محسوس کیا۔ ان کی نظموں اور عنوانات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً فتنہ لوح و قلم، خون آفتاب، فرعون کی سرزمین شعلہ شاداب، آشوب حرم، آدمی نامہ خدا کا آخری فرمان، جبر مشیت وغیرہ جیسی نظموں میں فکر کے میلان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ شور کی شاعری انیس، غالب چکبست اور اقبال کے اثرات کا اظہار ہے، فلسفہ حیات پر جو نظمیں کہی ہیں اس سے ان کے فکری پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''صلیب انقلاب'' میں موضوعات کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے باب انقلاب، سماج، تاریخ اور رومان و سیاست اس تقسیم سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی نظموں میں اقبال کی فکر اور فلسفہ کا بڑا دخل ہے۔ جن نظموں میں سماج کی عکاسی کی گئی ہے وہاں قلب و روح کی گہرائی کے ساتھ انسانی اقدار اور اس کے وقار کی بات موضوع بحث بنی ہے۔

پھوٹ کر جس میں سویرے کی کرن ڈوب گئی خون ارباب وطن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
میرے سورج کا اجالا، میری صبحوں کا فروغ میرے ماتھے کی شکن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
وقت کے ساز میں، آزادی افکار کا گیت فتنہ دار و رسن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
میں کہاں اور کہاں سلسلہ دار و رسن میرا قاتل، میرا فن تھا مجھے معلوم نہ تھا

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے شور اور ان کی شاعری پر کتنا جامع تبصرہ پیش کیا ہے۔

''پروفیسر شور ان معدودے چند شعراء میں ہیں جن کو دیکھ لینا شاعر کو دیکھ لینا ہے، جن کو سن لینا شعر کی موسیقی کو پالینا اور جن کو پڑھ لینا عصر حاضر کے تو انا رجحانات سے آگاہی حاصل کر لینا ہے۔''

احساسات اور جذبات کی شاعری میں جو ادراک انسانی اقدار کے حوالے سے ہے یہ شور کے اندر کے انسان کا عکس ہے۔

انسانیت کو کر کے حدود وطن میں قید دیوار چین و سرحد ہندوستاں نہ دیکھ
میں شاعر حیات ہوں میرا پیام سن میری زمیں نہ دیکھ مرا آسماں نہ دیکھ

ہندوپاک کے معتبر رسالوں میں شور کا کلام اور تنقیدی مضامین ۱۹۳۸ء سے تادم زیست شائع ہوتے رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی نے بھی شور کی شاعری کو بے حد پسند کیا۔ کلاسکی ادب میں غالب، شاد عظیم آبادی، نظیری، بیدل، عرفی اور اقبال کو پسند کرتے تھے۔ معاصرین میں مجاز، عدم جوش، جگر، جاں نثار اختر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی علی سردار جعفری اور اختر الایمان کی شاعری کو جدید شاعری سے تعبیر کرتے تھے۔ انگریزی شعراء میں ورڈز ورتھ، شیلے اور کیٹس سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ شور کے فن و شخصیت پر ملک کے نامور ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر عتیق احمد پروفیسر آفاق صدیقی پروفیسر سحر انصاری نے نہایت اہم اور پر مغز مقالے تحریر کیے ہیں۔ شور بہ اعتبارِ مزاج منافقت، جبر و استبداد اور ناانصافیوں کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے تھے۔ کیونکہ وہ گروہ بندیوں اور حلقہ بندیوں کے قائل نہ تھے۔ قدرت نے انہیں گہری فکر اعلیٰ تخئیل اور بالغ نظری عطا کی تھی۔

انہوں نے آئین عشق کے تحت، روشن خیالی، کیف و سرور اور درد کی چاشنی سے شاعری میں جذبات کی رنگارنگی اور خیالات کی ہمہ جہتی سے دل ہی کی گرہ نہیں کھولی بلکہ دماغ کی کھڑکیاں بھی کھلتی چلی گئیں۔ شور کے ہاں تخلیقی، تعمیری اور تنقیدی بصیرت کلام میں گیرائی، خیال میں نیا پن اور جذبہ و احساس نے شعری و ادبی عمارت کو واقعیت اور حقیقت کا روپ دے کر اسے ایک دلپذیر مرقع بنا دیا۔ وہ خوش مزاجی، شگفتگی و شائستگی اور روشن خیالی کی مثال تھے۔

اے شور بہاروں میں اکثر ہوتی ہے چمن کی رسوائی　　کیا بادِ صبا کے جھونکے بھی پھولوں کو ہنسانا بھول گئے

یہاں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ علامہ نیاز فتح پوری کو شور کی نظموں کا انتظار رہتا تھا اس بات کا ثبوت نیاز صاحب کے وہ خطوط ہیں جو لکھنؤ سے بنام شور تحریر کئے گئے۔ یہ خطوط راقم کے پاس محفوظ ہیں نیاز صاحب پروفیسر شور کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے ذہنی ارتقاء کے قائل تھے ان کی شاعری کو مستقبل کی نوید کہتے تھے اس ارتقائی عمل میں وہ نظمیں جو ہندوپاک میں زباں زدعام ہوئیں اور شور کو شہرت دوام حاصل ہوئی' ان میں سے چند کے اشعار درج ذیل ہیں۔

جہل کے معبود ہوں یا علم کے لات و منات　　　اہرمن یزداں بھی چلتے ہیں میرے سات سات

حال میرا نقش پا ماضی مرے صحرا کی خاک　　　آخرت میری قبا دنیا مرے دامن کا چاک

نظم نور جہاں کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

ابھی تو خود ہی اندھیرا ہے رہگزاروں پر　　　ابھی تو نور کا دھوکا ہے چاند تاروں پر

ابھی تو صبح کے سورج میں روشنی کم ہے　　　ابھی تو خاک پہ نجم و قمر کا ماتم ہے

ابن آدم کا لہو پیتے رہے کتنے خدا　　　امتوں کے خون میں ڈوبے ہیں کتنے دیوتا

کتنے فرعونوں کی سطوت، کتنے نمرودوں کے تاج　　　لے چکا میرا غضب کتنے خداؤں سے خراج

کتنے قزاقوں نے لوٹا اپنی جنتا کا سہاگ　　　کتنے بھیگے بادلوں نے پھونک دی خرمن میں آگ

--------------- (فرعون کی سرزمین)

پر شکستہ لفظ و معنی آبلہ پا عقل خام　　　لب کشائی کس کی جرأت کس کو یارائے کلام

عرش سے کوئی فرشتوں کی زباں لا دو مجھے　　　عالم لاہوت سے طرز بیاں لا دو مجھے

خاک پا لیتی ہے جس کی آسمانوں سے خراج　　　لوٹتے ہیں جس کی ٹھوکر میں شہنشاؤں کے تاج

معبد و ہیکل کو جس سے زلزلے آتے رہے　　　چین و یوناں جس کی عظمت کی قسم کھاتے رہے

وہ شہِ کونین وہ عصمت پناہ ہست و بود　　　ہر نفس جس کا عبادت ہر نظر جس کی سجود

--------------- (بندۂ یزداں صفات)

شور کے فکر و شعور اور ذہن و ضمیر کے آئینے میں تخلیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے اشعار میں روح عصر کا درد و غم اور انسانی اقدار کا مکمل ادراک ملتا ہے۔ جمالیات و انقلاب میں بھی توازن رکھتے ہیں۔ انہوں نے نظموں، غزلوں کے علاوہ رباعیات میں نئی جہتیں دی ہیں۔ ان کی رباعیات میں عمیق فکر، زور قلم اور تخیل و بلاغت نہایت آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ چند رباعیات جن سے شور کے ذہن و ضمیر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کر دیتی ہے قدرت جسے عظمت تقسیم　　آفاق میں ہوتا ہے وہی شخص عظیم
وہ شمع حسد سے نہیں ہوتی خاموش　　خود جس کو جلاتا ہے خداوند کریم

انسان ہے تا حد نظریوں نایاب　　جیسے کسی سیلاب کو پی جائے سراب
اشراف دبد آموز میں مشکل ہے تمیز　　تہذیب کے یوں ٹوٹ رہے ہیں اعصاب

شور اپنی شاعری کے متعلق ''ذہن وضمیر'' میں رقمطراز ہیں ''خلاق عالم کی زمین پر آزادی'' آدم کی اولاد کا پیدائشی اور بین الاقوامی ورثہ ہے، اور انسانی وحدت کے اس مقدس قانون کے تحت، نفس کی تہذیب، اخلاق ومروّت، باہمی بھائی چارہ عدل وانصاف، خیر وخلوص اور ایثار وانساں توازی نہ کسی خاص قوم کا اجارہ ہے نہ کسی مخصوص طبقے کی میراث، اس ابدی اور اٹل سچائی کی بنیاد پر انسانیت عظمیٰ کو نہ رنگ ونسل، نہ قومیت ووطنیت یا مذہب وسیاست کی آہنی زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، نہ جغرافیائی حدود میں قید کر کے رکھا جاسکتا ہے،،۔

مندرجہ بالا پیراگراف سے شور کے نظریات سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے دور حاضر کی سیاست نے بین الاقوامی سطح پر انسانیت کے جو پرخچے اڑائے ہیں۔ کشت وخون کا بازار، درندگی، بربادی، آگ اور بارود کا کھیل روز کا معمول ہوگیا ہے۔ جب قومیں یا قدریں رو بہ زوال ہوتی ہیں تو فن وادب پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شور نے اپنی رباعیات میں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار، انتہائی بصیرت آموز مضامین، موضوعات میں فطری حقائق، ذات کا عرفان، رمزی انداز گفتگو کو خیال انگیز پیرایہ میں پیش کیا ہے، ان رباعیات میں سیاسی، سماجی، تہذیبی ارتقاء کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ جو اپنے عہد کی ترجمانی بھی ہے اور مستقبل میں نئے امکانات کا اظہار بھی۔ انسانی فطرت کو اس شعر میں دیکھئے۔

عادتاً خضر کے ساتھ دنیا چلی　　فطرتاً ہم کو آگے نکلنا پڑا

شور علیگ کے ساتھ جو ناانصافی اور تعصب روا رکھا گیا اس کا اظہار انہوں نے رباعی میں یوں کیا ہے۔

کس گرد تعصب میں اٹا ہوں مت پوچھ　　کس بغض کی سولی پہ چڑھا ہوں مت پوچھ
کر میرے تشخص کے پرخچوں کا شمار　　میں کتنی [illegible] مت پوچھ

جمالیاتی رباعیات ملاحظہ کیجئے۔

تعبیر سے یہ خواب بُنا جاتا ہے　　یہ پھول تصور میں چُنا جاتا ہے
فطرت کے طرب خانے میں عورت ہے وہ گیت　　جس گیت کو آنکھوں سے سنا جاتا ہے

احوال کی پرسش نہ سلاموں کا جواب　　ایسے تو نہ تھے ہم بھی کبھی خانہ خراب
فرصت ہو تو اے گردش افلاک بتا　　کس ابر میں ڈوبا ہے ہمارا مہتاب

شور علیگ کی شاعری نصف صدی کی ایسی شاعری ہے جو سیاسی وسماجی پس منظر کی آئینہ دار ہے، دو جنگوں کی ہولناکیوں نے معاشی ومعاشرتی بحران میں بے پناہ اضافہ کیا۔ بین الاقوامی سطح پر تہذیبیں روبہ تنزل تھیں، ایسے میں چند تحریکیں وجود میں آئیں ان تحریکیوں سے اتنا ہوا کہ فکر کا انداز بدل گیا۔ شعرا وطن پرستی کے نغمے الاپنے پر مجبور ہو گئے، عوام کے مسائل اور ان کے مصائب پر شور نے بھی نظموں میں گہرے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ انسان کے درد وکرب کو محسوس کرتے ہوئے اپنی فکر اور ذہنی کرب کو نظموں میں اظہار کا ذریعہ بنایا۔

شور ایسے مسیحا کی حیثیت سے شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے جیسے علامہ اقبال ان دونوں کا درد، رنج وغم مشترک تھا۔ جو شاعر انسانیت اور اس کے دکھ درد کی بات کرتا ہے۔ اس کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو ہے تو انسان، وہی شاعر، شاعرِ اعظم کہلاتا ہے۔ شور کی شاعری میں عہد کی تاریخ نمایاں نظر آتی ہے کیونکہ وہ گرد وپیش پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ملک کی سیاست اور ماحول سے کبھی غافل نہ رہے۔ بلکہ وہ ان گہرائیوں میں اتر کر احساس وشعور اور خلوص دل سے نا آسودگیوں کا حل تلاش کرتے رہے۔ شور کی شاعری اقبال اور جوش کی طرح زندہ رہنے والی شاعری ہے۔

☆☆☆

نوید ظفر

کوہستانِ نمک

جرنیلی سڑک پر راولپنڈی سے لاہور جاتے ہوئے ۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سوہاوہ کے مقام سے دائیں ہاتھ ایک ذیلی سڑک کوہستان نمک کے تاریخی علاقے میں داخل ہوتی ہے کوہستان نمک کا بنیادی نام نمک کی کانوں کے حوالے سے ہے جو کھیوڑہ میں واقع ہیں سطح مرتفع سمندر سے اوسطاً دو ہزار فٹ بلند ہے اور زمین کا رنگ سرخ ہے، کھیوڑہ کی نمک کی کان دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے اور ایشیا کی طویل ترین کان ہے نمک کا معیار بہترین ہے' یہاں ۱۸۵۰ء سے نمک اوسطاً ایک لاکھ ٹن سالانہ نکالا جا رہا ہے کان کے اندر مرحلہ وار نمک نکالتے ہیں تاکہ پہاڑ کھوکھلا ہو کر گر نہ پڑے۔ چنانچہ سیاح کان کے اندر جا کر دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں پچاس ساٹھ فٹ طویل مربع علاقے میں نمک نکالنے کے بعد چار پانچ فٹ چوڑی نمک کی دیوار چھوڑ کر دوسرے حصے سے نمک نکالتے ہیں، چنانچہ کان کے اندر مختلف طویل کمرے سفید شیشے جیسی دیواروں کے ساتھ تعمیر نظر آتے ہیں، مقامی آبادی کا کہنا ہے کہ مغل بادشاہ شاہجہان نے تاج محل کا بنیادی خیال کھیوڑہ کی نمک کی کان سے لیا تھا۔ کان کے مرکز میں چھت ۱۵۰ فٹ تک اونچی ہو جاتی ہے، سیاحوں کی دلچسپی کے لئے گیس کے غباروں میں چراغ جلا کر انہیں چھت کے ساتھ لگا کر کان کو روشن کر دیا جاتا ہے۔ کان کے بعض حصوں میں پہاڑ سے بارش کا پانی رس رس کر جمع ہو جانے سے چھوٹی چھوٹی جھیلیں بھی بن گئی ہیں، جنہیں بعض فلموں میں فلم بندی کے لئے کشتی رانی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے کان سے نمک نکالنے کے لئے چھوٹے انجن والی ریل گاڑیاں چلائی جاتی ہیں، کان کا اندرونی نظام اعلیٰ سائنسی بنیادوں پر قائم ہے، پہاڑ میں سوراخ کر کے ہوا کے لئے راستے بنائے گئے ہیں تاکہ کان کے اندر مزدوروں کو سانس لینے میں دقت پیش نہ آئے۔ اس لئے گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں کھیوڑہ کی نمک کی کان میں حادثات کی تعداد صفر رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں سوڈا، کیمیائی اشیاء اور سیمنٹ کی فیکٹریاں قائم ہونے سے مقامی آبادی کو روزگار مہیا ہوا ہے' کھیوڑہ سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ڈنڈوت کے مقام پر کوئلے کی کانیں ہیں، جو نمک کی سفید معدنیات کے مقابلے میں سیاہ رنگ کا ایندھن فراہم کرتی ہیں۔

ڈنڈوت مہابھارت سے منسوب کوروپانڈو کی جنگی پہاڑی پانڈولی کے دامن میں واقع ہے، یہاں عہد غزنوی کی قبریں موجود ہیں جن میں انفرادی اور اجتماعی قبریں ایک تاریخی قبرستان میں یک جا ہیں ان قبروں کو گنج شہیداں کہا جاتا ہے۔

ڈنڈوت کے ایک مقامی جنجوعہ سردار راجہ گاماں خان نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی قافلے پر حملہ کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر قابو پانے کے بعد انگریز انتظامیہ نے ایک مقامی پہاڑ کی چوٹی پر عدالت منعقد کی تھی اور مقامی آبادی کے متعدد افراد کو انتقام کا شکار بنایا تھا۔

کوہستان نمک کا خوبصورت پہاڑی سلسلہ وادی در وادی کھلتا جاتا ہے، قدیم زمانے سے آباد رہا ہے، اور یہاں مختلف قدیم تہذیبوں کے نشانات تلاش کیئے گئے ہیں ان میں قدیم ترین شہر کٹاس ہے جو چکوال سے کھیوڑہ جاتے ہوئے کھیوڑہ سے ۱۶ کلومیٹر پہلے چوآسیدان شاہ کے پاس ہے۔

کٹاس کا قدیم شہر ہندوؤں کے لئے مقدس تیرتھ کی حیثیت رکھتا ہے، ہندو روایت کے مطابق شیو دیوتا کی آنکھ سے سیتی کے مرنے پر دو آنسو گرے ایک اجمیر میں پشکر کے مقام پر اور دوسرا کٹاس میں، چنانچہ کٹاس میں ایک چھوٹی جھیل ہندوؤں کے لئے پوتر یا مقدس ہونے کا درجہ رکھتی ہے، اور ہندو یاتری اس جھیل کے پانی میں نہا کر اپنے گناہوں سے نجات پانے کا تصور رکھتے ہیں، کٹاس کا قدیم نام کٹا کشابیان کہا گیا ہے جس کا مطلب بہنے والی آنکھ کہا جاتا ہے۔ کٹاس کو مندروں کا شہر کہا جاتا تھا یہاں آج بھی چھوٹے بڑے ایک سو سے زیادہ مندروں کے آثار ہیں ۱۹۴۷ء سے پہلے یہاں مسلمانوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی اور وہ یہاں سے باہر قریبی قصبہ چواسیدن شاہ میں رہتے تھے۔

کٹاس کا حوالہ بھارتی مقدس کتاب مہابھارت میں بھی پایا جاتا ہے اور کورو اور پانڈو بھائیوں کے درمیان تاریخی جنگ کٹاس کے قریب کوہستان نمک میں لڑی گئی تھی۔ چنانچہ کھیوڑہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام پانڈو ویلی ہے۔ کٹاس میں قدیم ترین مندروں میں ست گرہ مندر ہے جس کے بارے میں مختلف روایات ہیں بعض مورخین اس مندر کی بنیاد مہابھارت کے زمانے سے منسلک کرتے ہیں اور بعض روایات میں یہ تین منزلہ مندر مہاراجہ ہری سنگھ نے تعمیر کیا تھا۔ مقامی آبادی نے مندروں اور کٹاس کے قلعہ کو مذہبی رواداری کی بنیاد پر تحفظ دے رکھا ہے، تاہم اسلامی عبادات کے لئے ایک مسجد بھی تعمیر کر دی گئی ہے جو قدیم مندروں کے درمیان ایک انوکھا فن تعمیر کا منظر پیش کرتی ہے۔ کٹاس سے ۱۲ کلومیٹر کے

فاصلے پر ملوٹ میں دسویں صدی کے جنجوعہ قبیلے کے جدامجد راجہ مل کا قلعہ اور مندر موجود ہے ایک ہزار سال پرانے فن تعمیر کے یہ نوادرات سیاحوں کیلئے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ملوٹ اور کٹاس کے درمیان شیو گنگا کا تاریخی قصبہ ہے یہاں بھی ایک مندر کے آثار ہیں، جو کشمیری ہندو طرز پر بنایا گیا ہے اس مندر سے بعض بدھ دور کے نوادرات بھی برآمد ہوئے ہیں جنہیں لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ کیا گیا ہے۔

کٹاس سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر چواسیدن شاہ کا چھوٹا شہر آباد ہے یہاں حضرت سیدن شاہ شیرازی کا مزار مرجع خلائق ہے اور مقامی آبادی کی بڑی زیارت گاہ سمجھی جاتی ہے شہر اسی زیارت گاہ کے گرد پھیلا ہوا ہے۔ایک روایت کے مطابق سیدن شاہ شیراز سے اس علاقے میں تشریف لائے تھے اور ان کی کوششوں سے بہت سے ہندو مسلمان ہو کر یہاں آباد ہو گئے تھے تاہم یہاں پر پانی کی قلت تھی اور مقامی ہندو علاقے کے نومسلموں کو پانی مہیا کرنے میں سختی کرتے تھے۔اس صورت حال کا مداوا کرنے کے لئے حضرت سیدن شاہ نے کٹاس کے تالاب میں اپنا عصا مارا اور اپنی لاٹھی گھسیٹتے ہوئے تین کلومیٹر تک پانی کو اونچے نیچے راستوں سے چواسیدن شاہ تک لے آئے۔چوا کا لفظی مطلب مقامی آبادی میں چشمہ ہے یہ چشمہ آج بھی جاری ہے اور اس کی بدولت یہاں بطخیں کثیر تعداد میں سیر کرتی نظر آتی ہیں۔چواسیدن شاہ میں گلاب کے پھول اور لوکاٹ کے باغات کثرت سے پائے جاتے ہیں ایک روایت کے مطابق اکبر بادشاہ نے یہاں کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر سولہویں صدی میں اپنا دارالحکومت یہاں منتقل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تاہم اس کے درباریوں کا خیال تھا کہ کوہستان نمک میں مستقل قیام کے بعد سے بنارس اور کابل تک کی طویل راجدھانی پر حکومت کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

ساتویں صدی کے چینی سیاح ہیون سانگ نے اس مقام کا حوالہ اپنے سفر نامہ میں ''سنگھاپورہ'' تحریر کیا ہے اپریل کے مہینے میں فصل کی کٹائی کے موقع پر چواسیدن شاہ میں سالانہ میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے لوگ کھیلوں دنگل اور کشتی کیلئے اکھٹے ہوتے ہیں، کٹاس کے ایک جانب چواسیدن شاہ آباد ہے تاہم دوسری جانب ایک اور تاریخی شہر کلر کہار آباد ہے کلر کہار کی جدید شہرت گزشتہ چند برسوں میں موٹر وے تعمیر ہونے سے نمایاں ہوگئی ہے اب یہ شہر جدید سڑک سے منسلک ہونے سے ایک دفعہ پھر لوگوں کی نظروں میں آگیا ہے۔اور اس طرح کوہستان نمک جو جرنیلی سڑک کا راستہ تبدیل ہو جانے سے گمنامی کا شکار ہو گیا تھا اب پھر تاریخ میں اپنا کردار ادا کرتے

کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ کلر کہار کا خوبصورت شہر ایک آٹھ میل طویل جھیل کے کنارے آباد ہے جھیل کو پر کشش بنانے کے لئے یہاں کشتی رانی کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ کوہستان نمک کی طویل جھیل مقامی پہاڑوں میں نمک کی کثرت کے سبب نمکین ہے تاہم مقامی روایت میں اس جھیل کے نمکین پانی کا حوالہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بارھویں صدی میں مقامی ہندوؤں نے مسلمان درویش بابا فرید گنج شکر کو یہاں سے پانی پینے سے روکتے ہوئے کہا تھا کہ پانی نمکین ہے جس پر بابا فرید نے جواب دیا کہ اگر یہ پانی نمکین ہے تو نمکین ہی رہے گا۔ چنانچہ کلر کہار جھیل کا پانی نمکین ہو گیا۔ تاہم بعض ماہرین کے نزدیک کلر کہار کی زمین میں نمک کی موجودگی پانی کے نمکین ہونے کا سبب ہے۔ کلر کہار میں لوکاٹ اور گلاب کے باغات کثرت سے موجود ہیں چنانچہ یہاں کی مقامی صنعت میں عرق گلاب تمام پاکستان میں مہیا کیا جاتا ہے کلر کہار کے باغات میں مور کثرت سے پائے جاتے ہیں اور علاقے کی سیر کرنے والے افراد سے گھل مل جاتے ہیں۔

۱۵۲۵ء میں بابر بادشاہ نے بھیرہ پر حملہ کرتے ہوئے کلر کہار کی ایک چٹان پر کھڑے ہو کر اپنے لشکر کی صف بندی کی تھی۔ وہ چٹان جہاں بابر کھڑا ہوا تھا آج بھی تخت بابری کہلاتی ہے سیاحوں کی دلچسپی کیلئے بابر کے حملہ کی تفصیلات ایک پتھر پر کندہ کر کے وہاں نصب کر دی گئی ہیں کلر کہار کے خوبصورت علاقے میں انتظامیہ نے ریسٹ ہاؤس تعمیر کروا رکھے ہیں، ان میں ایک ریسٹ ہاؤس مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی سے منسوب ہے جسے انہوں نے چالیس برس قبل ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے تعمیر کروایا تھا اور وہاں کسی سیاح خاتون کو اونچی ایڑی کے جوتے کے ساتھ چلنے میں مشکل پیش آتے دیکھ کر فی البدیہہ کہا تھا

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر سنگ مرمر پر کندہ کر کے کلر کہار کے ایک ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر نصب کر دیا گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی ریسٹ ہاؤس کے اندر قدیم تہذیب کا ایک عجائب گھر بھی تعمیر کیا گیا ہے جہاں کوہستان نمک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال قبل قدیم جانوروں کے جبڑے اور دیگر ہڈیاں ایک مقامی گاؤں امیر خاتون سے دریافت کر کے یک جا کر دیئے گئے ہیں۔

کوہستان نمک کا سب سے اہم اور آباد شہر چکوال ہے چکوال شہر کی تاریخ بہت قدیم بیان کی جاتی ہے تاہم ۱۸۵۰ء کی تاریخ میں چکوال نام سے کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ شہر میں قدیم تعمیراتی حوالہ ایک بڑا

دروازہ ہے جسے برانڈرتھ گیٹ یا برانڈرتھ ڈیوڑھی کہا جاتا ہے۔ڈیوڑھی میں نصب سنگ مرمر کی ایک کندہ تحریر کے مطابق مقامی انگریز عہدیدار برانڈرتھ نے مقامی ڈپٹی کمشنر جی۔ملاک اور تحصیلدار پنڈت ہری کشن کے ساتھ مل کر مقامی زمینداروں کو آباد کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا یہ تختی برانڈرتھ کے انتقال کے موقع پر ۱۸۹۲ء میں نصب کی گئی تھی۔

چکوال کا بنیادی مطلب چک قبیلہ کا شہر کہا جا سکتا ہے چک بہادر اور جنگجو لوگ تھے جنہوں نے مختلف زمانوں میں اپنی بہادری اور خودمختاری کی داستانیں رقم کی ہیں۔شہر میں بہت سے تعلیمی ادارے اور بنک قائم ہیں موٹروے سے منسلک ہو جانے کے سبب چکوال شہر ایک دفعہ پھر اہمیت حاصل کر گیا ہے ۔کوہستان نمک کے بلند قامت اور چوڑی چھاتی والے مردوں کی بڑی شہرت ان کی بہادری ہے گزشتہ کئی ہزار برس سے یہاں کی آبادی فوجی شہرت کی حامل رہی ہے کٹاس سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ڈومیال گاؤں کے ایک سپاہی سرتاج نے پہلی جنگ عظیم میں اپنی بہادری کے حوالے سے سب سے بڑا جنگی اعزاز وکٹوریہ کراس حاصل کیا تھا۔اس کے اعزاز کی بدولت ڈومیال گاؤں کو ایک اعزازی توپ عطا کی گئی۔یہ توپ آج بھی ڈومیال گاؤں کا امتیازی نشان ہے۔

ڈومیال کے مقامی سکول کے صحن میں ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ عبادت بھی کندہ ہے کہ ۱۵-۱۹۱۴ کی جنگ عظیم کے دوران اس گاؤں سے ۴۶۰ افراد لڑائی میں شریک ہوئے تھے جن میں سے ۹ نے اپنی جانیں قربان کیں۔کوہستان نمک سے پاکستان فوج کا تعلق بھی سب سے نمایاں رہا ہے اور آج بھی یہاں کے نوجوانوں کی سب سے بڑی خواہش فوج میں بھرتی ہے تاہم کوہستان نمک کی سب سے نمایاں خصوصیت نندنا کا قلعہ ہے جہاں محمود غزنوی کے دور میں البیرونی نے پانچ سال قیام کے دوران ''کتاب الہند'' تحریر کی تھی اور مختلف پیمائشوں کے ذریعہ زمین کا قطر ماپا تھا۔غزنوی عہد کی قبریں البیرونی سے منسوب ایک رسدگاہ اور نندنا کے قدیم مندر سے منسوب آثار آج بھی نندنا کے بلند ٹیلے پر پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی

جیون کتھا

میرا نام انجمن ترقی اردو ہے۔ میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئی۔ آرنلڈ نے میرے سر پر دست شفقت رکھا، شبلی نے مجھے اپنے دامان لطف میں لیا۔ میں خیر سے اب ۸۳ برس کی ہوں لیکن قوموں، زبانوں اور تحریکوں کی عمریں روز و شب اور ماہ و سال کے پیمانے سے نہیں ناپی جاتیں۔ یہ میری بڑی بہن ہیں، میں انہیں آپا اردو کہتی ہوں۔ جب مجھے مولوی عبدالحق نے گود لیا تو مجھے آپا اردو کے ساتھ ہی رکھا یہ خوش کہ انہیں ایک چھوٹی بہنا مل گئی میں شاد کہ مجھے آپا اردو۔ زندگی بھی عجب داستان عبرت و حیرت ہے ان کی راہ حیات میں سکھ رت کم آئی دکھ کے موسم زیادہ آئے بس اک طویل جادہ پر خار اور آبلہ پا مسافر!

آپا کہتی ہیں کہ جب یہ پیدا ہوئیں تو ہر شہر و دیار کے لوگوں نے کہا یہ ہماری بیٹی ہے ہماری آنکھوں کی روشنی، ہمارے دل کی ٹھنڈک ہے سندھ والے بولے اس بچی نے ہماری وادی میں آنکھ کھولی دکن والوں نے کہا اس نے ہمارے یہاں بولنا سیکھا پنجاب والوں نے کہا اس کا عہد شیر خواری ہمارے آنگن میں گزرا دلی والوں نے کہا نام خدا، اس بچی نے ہمارے یہاں قد کاٹھ نکالا آپا کہتی ہیں میں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی کہ اتنے مہربانوں کا سایہ مجھ پر ہے اور ایسی ایسی آغوش محبت میرے لیے وا ہے۔ ایک دفعہ آپا مجھے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کا حال سنانے لگیں۔ بولیں، عہد ماضی میرے فخر کا سرمایہ ہے۔ پورے برصغیر میں مجھے ٹوٹ کر پیار ملا۔ بزرگان دین، صوفیائے کرام، علما، سلاطین، رئیسوں، امیروں سبھی نے میری قدر بڑھائی، اپنے اپنے علاقوں کی بولیوں ٹھولیوں اور زبانوں کی مٹھاس نے میرے کام و دہن کو شیریں کیا۔ لیکن بہنا! جب خدا قبول عام دیتا ہے تو موئے جلنے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، انسان کی مٹی میں خیر و شر دونوں گندھے ہوئے ہیں۔ اتنا کہتے ہوئے آپا کے دمکتے چہرے پر اچانک دکھ کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے دلگیر لہجے میں کہا۔ موئے ہندو اور کم بخت فرنگی میری جان اور آبرو کے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے میرے مقابلے پر نگوڑی ہندی کو لا کھڑا کیا۔ انقلابات زمانہ دیکھئے مجھ جیسی نجیب الطرفین، اقدار شرافت کے سائے میں پلنے بڑھنے والی، تہذیب

کے ماحول میں سن شعور کو پہنچنے والی، نفیس طبع، لطیف مزاج بی بی اور میرا مقابلہ کس سے! خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے سرسید کو کہ انہوں نے دست درازیوں کے اُس عہد وحشت میں میرے ناموس کا تحفظ کیا اور مجھے بے ردا نہ ہونے دیا۔ اور کتنے ہی بزرگ اور عزیز سینہ سپر ہو کر میرے دفاع میں ڈٹ گئے اور میرے بدخواہوں کے ایک ایک وار کا توڑ کیا۔ اسمبلی میں، جلسوں میں، اخباروں رسالوں میں، زبان سے، قلم سے میرے حق میں آواز اٹھائی۔ ہر سیاسی حربے کو کند کیا۔ سبھاؤں کے جواب میں تنظیمیں بنائیں۔ ۱۹۰۰ء میں مجلس تحفظ اردو کی نیو اٹھائی۔ اللہ نواب محسن الملک کے درجات عالی کرے۔ انہوں نے کیا کیا احسان نہ مجھ پر کیے۔ ان لفظوں کو ادا کرتے ہوئے آپا اردو کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ اُنہوں نے فرط جذبات سے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا: اور پھر میری پیاری بہنا ۱۹۰۳ء میں تم پیدا ہوئیں۔ اُدھر شبلی، حبیب الرحمٰن شروانی، عزیز مرزا کن کن محسنوں کا نام لوں، مجھ پر مہربان ہوئے۔ پھر وہ سب بھی تو مجھ پر احسان کرنے والے ہیں جنہوں نے نثر و نظم کے انمول جواہرات ڈھیروں ڈھیر مجھ پر نچھاور کیے اور میری خوش بختی اور عزت میں اضافہ کیا۔ تم چھ سال کی تھیں کہ ۱۹۰۹ء میں اللہ نے ہمیں، ہم دونوں کو ایک ایسے مہربان بزرگ کا سایہ نصیب کیا جن کے دل میں ہمارے لیے دنیا بھر کے ماں باپ کی محبتوں کا اُجالا سمٹ آیا تھا۔ یہ مولوی عبدالحق تھے جن کی بیکراں چاہت کی مثال زبان و ادب کی عالمی تاریخوں اور تحریکوں میں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ ان کا ایثار، قربانیاں، جاں فشانیاں محبت کے ایک انوکھے تجربے کا ظہور ہیں!

ہمارے بابا جان نے خدا اُن کے مرقد کو نور سے بھرے میری پیشانی سے مفلسی اور تہی مائیگی کا داغ مٹا دیا۔ میرے اظہار و ابلاغ کے افق کو وسیع کیا۔ بابا جان نے تخلیق، تحقیق اور تنقید کی ترکیب باہمی سے میرے مزاج میں اعتدال اور میری شخصیت میں وقار اور نکھار پیدا کیا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنی ناموری کے لیے کرتا ہے میں بابائے اردو کے ایثار کی اس ادا کو کیا نام دوں کہ اُنہوں نے دوسروں کو شہرت اور بقائے دوام بخشی۔ دوسروں کو ماضی کے گوشہ گمنامی سے نکالا۔ قدیم ادبیات عالیہ کو بوسیدگی کی قبروں سے نکال کر حیات تازہ عطا کی۔ ترجمے کیے۔ دوسری زبانوں کے ادب پاروں کو اردو کا حسین جامہ پہنایا۔ ہر ادبی، علمی، تحقیقی موضوع کو اُنہوں نے اپنے التفات سے نوازا۔ فروغ اردو کے لیے رسالے نکالے۔ جدید سائنسی علوم و فنون کے جریدے جاری کیے۔ مکتبوں، درسگاہوں اور کتب خانوں کا

اجرا کیا۔ مولوی صاحب نے کون سے پھول تھے جن سے میرے دامان جمال وکمال کو معمور نہیں کیا! جب بہن انجمن! تمہارا دفتر دلّی سے اورنگ آباد منتقل ہوا تو تمہیں اس وقت کی بے سروسامانی تو اب تک یاد ہوگی...... ہے نا؟ تمہارا کُل اثاثہ ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کے سبب رسّی سے کسا ہوا، اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے مسودے، ایک قلم ایک دوات۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ پھر جب اورنگ آباد میں ۲۵ سال گزار کر تم نے ۱۹۳۸ء میں دلّی نقل مکانی کی تو ماشاءاللہ کیسا کیسا سازوسامان تھا کہ تمہارا جلوس کسی شہزادی کا جلوس لگتا تھا۔ یہ سب بابا جان کی ریاضتوں کا ثمر تھا۔ اتنا کچھ کہہ کر آپا اردو سانس لینے کو رکیں تو میں نے عرض کی۔ اور وہ سب سے بڑا احسان آپ بھول گئیں، آپ پر انگشت نمائیاں ہوتی تھیں کہ آپ اتنی ادھوری ہیں کہ ذریعۂ تعلیم بن ہی نہیں سکتیں اور جدید سائنسی علوم کو آپ کی زبان مل ہی نہیں سکتی، کہ انگریزی بڑی تیز طرار، رنگیں زبان، شیوہ بیان ذریعۂ ابلاغ ہے۔ تب بابا جان کی برکت سے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اور کراچی کے اردو کالج میں یہ حیرت انگیز اور خوشگوار تجربہ بھی ہوا اور دنیا آپ کے اس باطنی کمال کے ظہور سے حیرت زدہ رہ گئی!

یہ باتیں سنتے سنتے، جانے آپا کو کیا دھیان آیا کہ اُن کی خوب صورت پلکوں پر یہ موٹے موٹے آنسو دکھائی دینے لگے۔ بمشکل آنسو ضبط کر کے وہ بولیں، ۱۹۴۸ء کا آشوب تمہیں اب تک یاد ہوگا۔ جب ہمارے بابا جان کو ہندوستان سے دیس نکالا ملا۔ نیرنگئ سیاست دوراں نے وہ فتنہ بیدار کیا اور وہ قیامت توڑی کہ اُن کی ساری متاعِ حیات سارا علمی خزانہ تلف ہوگیا۔ دل پر پتھر کی سل، لبوں پر قفلِ سکوت، چہرے پر غبارِ بے کسی، ہمارے بابا جان تمہاری انگلی پکڑ کر اور میرا بازو تھام کر ہجرت کے سفر پر نکلے اور کراچی ہم خستہ دلوں آشوب زدوں اور آشفتہ سامانوں کی منزل بنی۔ اُس سرفروش مجاہد نے پھر کمر ہمت باندھی، تمہارے تحفظ اور میرے تشخص کے لیے پھر مستعد ہو گئے۔ کچھ نے دستِ اعانت بڑھایا۔ کچھ نے بے مروتی دکھلائی، لیکن اُن کا جہاد جاری رہا۔ وہی ترجمہ وتحقیق وہی تصنیف وتالیف وہی گمشدہ ادبی سرمائے کی بازیابی، وہی ذریعۂ تعلیم کے مسائل کا حل، وہی عالمی اصطلاحات کی تشکیل، وہی قدیم ماخذوں کی تلاش وتحفظ، وہی علوم وفنون کا فروغ وہی اعلیٰ قومی درسگاہوں کا باقاعدہ اجرا، وہی اشاعتِ علم وادب، وہی قومی یکجہتی کے استحکام کے لیے مسلسل جدوجہد اور پھر ۶۱ء میں ہمارے بابا مر گئے۔ محسنِ اعظم کا سایہ اٹھ گیا۔ اس حادثے کو یاد کر کے ہم دونوں بہنیں دیر تک روتی رہیں۔ آنسو تھے کہ

ساون بھادوں کی جھڑی، جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو میں نے کہا۔ آپا! بابا جان کے اٹھنے کے بعد علم و سیاست کے افق سے وہ آندھیاں اٹھیں کہ ہمارا وجود شمع لرزاں بن گیا وہ تو خدا کی رحمت اور ہمارے بہی خواہوں کی شفقت نے فانوس بن کر حفاظت کی، لیکن آپا! تم بھی کیا تقدیر لکھوا کر لائی ہو کہ تمہارے دکھ کے موسم ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ اُدھر ہندوستان سے تمہیں دیس نکالا ملا ادھر کوئی علاقہ تمہیں اپنے یہاں حقوق شہریت دینے کو تیار نہیں ہے۔ وہاں کے ہندو تمہیں موسلوں کی زبان سمجھ کر تمہاری جان اور عزت کے درپے تھے۔ ادھر تقریباً ساٹھ سال گزارنے کے باوجود تم پناہ گزیں ہو۔ جب تم پیدا ہوئی تھیں تو سب تمہیں ماں باپ کا پیار دیتے تھے اب خیر سے اپنے گھر لوٹی ہو کہ تمہارے رشتہ داروں کی آنکھوں پر غیریت کے ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ تمہاری پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ پھر وہاں ہندی کا سیاپا تھا۔ یہاں انگریزی کا جلاپا ہے یہ موئی بوڑھی فرنگن اپنے سفید چونے جیسے چہرے پر غازہ تھوپ کر ہمارے انگریز پرست جوانمردوں کے ذہنوں میں دام فریب بچھائے بیٹھی ہے۔ ایک مقتدر طبقہ اس عروس ہزار داماد کے نخروں پر ہزار جان سے فدا ہے اور آپا تمہاری تذلیل اور تحقیر میں ناقدرے لوگ سرگرم ہیں۔ ادھر کوئی علاقہ تمہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ تم تو ایک گلدستہ تھیں اور سبھی نے اپنے اپنے گلہائے رنگ رنگ سے تمہاری تشکیل اور تزئین کی تھی۔ سندھی، پنجابی، سرائیکی، بلوچی، پشتو، ڈھیر سارے پھولوں، رنگوں، خوشبوؤں کے امتزاج کا نام اردو ہے۔ ساری کرنیں سارے اجالے مل کر ایک اجتماعی تہذیب و ثقافت کے سورج کو طلوع بخشتے ہیں اور قومی تشخص جگمگانے لگتا ہے۔

ارے آپا! تم پھر رونے لگیں۔ آؤ دونوں گلے مل کر جی بھر کر رو لیں کہ ہم اپنے وطن میں اجنبی ہیں اور رشتوں کی حرمتیں، غبارِ بے مروتی میں گم ہو چکی ہیں!

خاکہ

عبدالحمید اعظمی

یاد قبیلہ پشاور کا

پشاور سے میرا تعارف بہ سلسلہء ملازمت گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی کے آغاز میں ہوا۔ قیام پورے ۳۶۵ دن پر محیط تھا۔ ابتدائی ۶۵ دن نمک منڈی کے میونسپل فلیٹ میں اور باقی ۳۰۰ صدر میں اسٹیٹ بینک کی عمارت کے عقب میں کچنر لین کے ایک بوسیدہ متروکہ مکان میں گذرے جو ریڈیو کو الاٹ ہوا تھا۔

نمک منڈی کے فلیٹ کی بالکنی بازار میں کھلتی تھی۔ جس کے دائیں جانب ایک چھوٹا سا چوک ہے۔ بائیں جانب اور سامنے خیبری تکے کی آٹھ دکانیں تھیں جہاں دوپہر تک چالیس پچاس دنبے ''شکم پورہ'' کے قبرستان میں دفن ہو جاتے تھے۔ ابھی آئے ہوئے ہفتہ عشرہ ہوا تھا کہ ربیع الاول کا چاند نکل آیا۔ چپکے سے نہیں بلکہ تڑاتڑ گولیوں کی گونج میں! شام میں دفتر سے واپس آئے تو دیکھا کہ چوک میں جلسے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ جھنڈیاں لگ چکی تھیں۔ سامنے ایک در والی چھوٹی سی دکان کے تھڑے پر دریوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ لاؤڈ سپیکر بھی نظر آیا۔ معلوم ہوا سیرت النبیؐ کا جلسہ ہوگا۔ ہوش اڑ گئے کہ ساری رات جاگنا ہوگا۔ فلیٹ لاؤڈ سپیکر کی زد پر تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد سڑک پر دریاں بچھ گئیں۔ دکان کا تھڑا اسٹیج بن گیا۔ اردگرد کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ نعرے لگنے لگے۔ مقرروں نے زور اس نکتے پر صرف کیا کہ رسولؐ اکرم ہمارے آپ کی طرح انسان تھے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد نعروں کے درمیان دریاں سمٹ گئیں جلسہ برخواست ہو گیا۔ سڑک کھل گئی۔

دوسری شام پھر وہی اہتمام' وہی دریاں' وہی اسٹیج' وہی سامعین' البتہ کارکن بدلے ہوئے تھے۔ مقررین دوسرے تھے۔ موضوع بھی کل کے بالکل ہی برعکس تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ''نور'' ہیں۔ اسی جوش سے کل ہی والے سامعین نے نعرے لگائے' دو گھنٹے بعد جلسہ ختم ہو گیا' کوئی اور شہر ہوتا تو گولیاں چل جاتیں مسئلہ اتنا ہی نازک تھا۔ مگر پشاور کے لوگوں کی بردباری پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ رواداری' مفاہمت اور ایک دوسرے کے نقطہء نظر کے احترام کا یہ انداز باہر سے آنے والوں کو متاثر کئے

بغیر نہیں رہتا۔

اس زمانے میں قاضی احمد سعید (مرحوم) ہمارے ڈائریکٹر تھے۔ان کے کمرے سے متصل ان کے نائبوں کا کمرہ تھا۔ایک میز پر یوسف بنگش کرسی سنبھالے تھے۔دوسری میز میرے حصے میں آئی۔ عادت سے مجبور تھا' اس لئے جہاں فرصت ملتی بنگش سے مقامی تاریخ' تہذیب وثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ایک روز کچھ اور بھی احباب جمع تھے۔پٹھان نسل' اس کی تاریخ اور کارناموں کا ذکر ہورہا تھا کہ اچانک ایک صاحب نے فرمایا' ان بے سروپا باتوں پر وقت ضائع نہ کریں۔ یہاں پٹھان (پختون) کوئی نہیں ہے میں چونک پڑا۔بولے مذاق نہیں ہے بات سو فیصد درست ہے۔اعظمی صاحب آپ کے پاس جو کوئی آئے اسے چیلنج کردیں کہ وہ پٹھان نہیں ہے۔ میں پختونوں کی غیرت کے قصے پڑھ چکا تھا' سن چکا تھا۔یوپی کے پٹھانوں میں بھی پٹھولی (پختون دلی) کی داستانیں عام تھیں۔بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں۔اپنا انجام سوچ کر کانپ گیا اور اعلان کردیا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ بس کا ہے آپ ہمت کریں۔اگر خدانخواستہ کسی نے آپ کا کام تمام کردیا تو آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم سب کا انتقام لے کر دم لیں گے۔میں نے کہا انتقام میرے کس کام کا۔سب ہنس رہے تھے اور میرے منھ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔میرا منھ بند تھا مگر خوفناک بلکہ خوں آشام انجام مُنہ کھولے کھڑا تھا۔

خوف کے اس گھپ اندھیرے میں دیکھا کہ پشتو تقریروں کے پروگرام آرگنائزر رشید علی دہقان کمرے میں داخل ہورہے ہیں ہارون نے ہانک لگائی ۔اعظمی ہو جاؤ تیار آزمائش شرط ہے۔ دہقان سے بے خوف ہو کر پوچھ لو۔ میں جانتا تھا کہ دہقان قبائلی علاقہ کا رہنے والا ہے۔اس کا تخلص ''دہقان'' اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے اور اعلان بھی۔وہ گریجوایٹ ہے تاہم تعلیم اور وہ بھی اسلامیہ کالج پشاور کی تعلیم بارود کو کتنا نم کرسکتی ہے۔اس موقع پر اچانک ایک ماہر تعلیم کا قول یاد آگیا کہ تعلیم باہر سے کچھ نہیں دیتی صرف داخلی صلاحیتوں کو چمکا دیتی ہے۔اس اصول کے مطابق تعلیم نے دہقان کو دہقان تر بنادیا ہوگا۔وہ تو کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ نرا شاعر ہے۔اپنے گاؤں اس لئے نہیں جاتا کہ وہ بندوق اٹھانا نہیں چاہتا۔ایک بار دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے والدہ اور بھائی سے ملنے گاؤں گئے۔ اہل خاندان نے پوچھا بندوق کہاں ہے بولے اس کی کیا ضرورت ہے گھر والوں نے صاف صاف کہدیا

آنا ہے تو مردوں کا زیور کندھے سے لٹکا کر آنا' ورنہ ہم سب کی سبکی یوں نہ کرو' تمام عمر شہر میں گذار دی گاؤں کا رخ نہ کیا۔ جسے ملاقات منظور ہوتی خود شہر آجاتا جب یاروں کا اصرار زور پکڑ گیا تو ڈرتے ڈرتے کہہ ڈالا رشید تم پٹھان تو نہیں ہوا اتنا سنتے ہی وہ میری طرف بڑھے۔ کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ میز سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں اور لگا گولی کا انتظار کرنے۔ کہیں دور سے قہقہوں کی آواز بلند ہوئی۔ سوچا شکار اتنے قریب دیکھ کر موصوف اظہار مسرت فرما رہے ہیں اور یار اپنی کامیابی پر خوش ہیں۔ اسی گومگو کے عالم میں دہقان کی نرم و با ادب آواز سنائی دی۔ اعظمی صاحب ہمارا قبیلہ دوڑ سے جو فلاں صدی میں فلاں علاقے سے آکر یہاں آباد ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے ہم پختون نہیں ہیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں محفل نے مبارکباد دی پہلا تجربہ کامیاب ہوا۔

چند دنوں کے بعد میں کاغذات لے کر قاضی صاحب کے پاس جانے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ بنگش نے کہا قاضی صاحب مصروف ہیں۔ اس وقت ان کے پاس باچا خان کے چھوٹے صاحبزادے عبدالغنی خان آئے ہوئے ہیں کہا چلئے ملتے ہیں۔ بولے نہیں اس کی ضرورت نہیں' ان کا معمول ہے میرے پاس ضرور آتے ہیں۔ اس کے بعد بنگش نے ان کی ذاتی خوبیوں اور تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں بڑے کام کی باتیں بتائیں۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد خان صاحب تشریف لائے۔ بنگش سے معانقہ' مصافحہ ہوا۔ میرا تعارف ہوا تو مصافحہ اور معانقہ۔ میں نے ان کا سراپا بغور دیکھا۔ بنگش نے بتا دیا تھا کہ خان صاحب سرتا پا فن ہی فن ہیں۔ زمین' جائیداد' فصلوں' مزارعوں سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں۔ بیوی پارسی ہیں۔ اس لئے اندرون خانہ بھی۔ مقامی ثقافت کے اثرات خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ ان سے پیار کرنے والے بے شمار ہیں جو انہیں لے وَنے خان (مجنوں خان) کہتے ہیں۔ بنگش نے نہایت سنجیدگی سے کہا خاندانی روایات کی رو سے اعظمی صاحب بھی خود کو سوات کا پٹھان کہتے ہیں حالانکہ کسی طرف سے وہ نہ پٹھان نظر آتے ہیں نہ سواتی۔ وہ پٹھانوں کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں۔ جاننا چاہتے ہیں کہ یہاں کون کون سے قبائل اصلاً اور نسلاً پٹھان ہیں۔ بولے میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔ یہ بات کسی پٹھان سے پوچھیں۔ میں نے فوراً سوال داغ دیا۔ کیا آپ پٹھان نہیں ہیں۔ بولے بالکل نہیں ہم تو اصلاً یونانی ہیں۔ ہماری ناک دیکھئے' گال کی ابھری ہوئی ہڈی گواہی دے رہی ہے۔ ٹھوڑی کی بناوٹ چغلی کھا رہی ہے۔ ہماری اپنی خاندانی روایات ہیں۔ اگر چہ

صدیوں کے روابط سے مقامی رنگ غالب آ گیا ہے۔تاہم دو چار خصوصیات اور عادتیں ایسی ہیں جو عام معاشرتی رنگ سے قدرے بے رنگ ہیں۔تو آپ پٹھان نہیں ہیں۔یونانی الاصل ہیں بولے دریں چہ شک۔میں نے کہا اسی لئے آپ لوگوں کو دیوتاؤں کی طرح پوجا جا رہا ہے۔اس کے بعد یونانی عبادات اور دیوی دیوتاؤں کے موضوع پر پورا دبستان کھل گیا۔باتیں بڑی خوبصورت اور پراز معلومات تھیں۔ پھر ایکدم اچانک اٹھے' جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔رخصت لی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے موٹر میں بیٹھ گئے۔غنی خاں تو رخصت ہوئے مگر سوال پٹھان کون ہے' دماغ میں کلبلاتا رہا۔کچھ دنوں بعد پروفیسر تقویم الحق کاکا خیل کسی تقریر کے سلسلے میں تشریف لائے۔ان سے یہی سوال کیا اور کہا کہ مجھے پتہ ہے آپ سید ہیں اس لئے پٹھان ہو ہی نہیں سکتے۔بولے آپ سے کس نے یہ کہہ دیا میں بالکل پٹھان ہوں ان کے اس انکشاف پر میں گنگ ہو گیا۔میری حالت دیکھ کر انہوں نے کہا جناب والا اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہاں جو بھی پشتو بولتا ہے مادری زبان پشتو ہے وہ پٹھان ہے۔جو یہ زبان نہ بولے اس کا دعویٰ بے دلیل سمجھا جائے گا۔اس بات نے مسئلہ اور الجھا دیا۔میرے لئے آج تک یہ عقدہ کھلا نہیں' کھلے کیونکر۔

ڈور کو سلجھا رہا ہوں اور سرا ملتا نہیں

یہ راز راز ہی رہا۔میرے سامنے راز مرادآبادی مرحوم آ گئے جو نسلاً مستند یوسف زئی تھے اور اردو میں اہل زبان ہونے کے دعویدار بھی۔جوشؔ مرحوم ڈرے کے خالص پٹھان اور اردو ادب کی بلند چٹان پر زبان کے نگہبان تھے۔

میرے فرائض میں اردو پروگراموں کی ذمہ داری کے علاوہ انتظامی امور بھی تھے ایک بار چند نائب قاصد بھرتی کرنے تھے۔انٹرویو بورڈ میں قاضی احمد سعید صاحب (ڈائریکٹر) اور میں صرف دو ہی تھے۔پہلا امیدوار آیا۔قاضی صاحب نے اس سے بڑے اونچے اور کرخت لہجے میں سوالات پوچھے۔ میرا لہجہ' قبلہ' عزیزم' اک ذری آپ کو زحمت ہو گی والا تھا۔اس امیدوار کے رخصت ہوتے ہی قاضی صاحب نے فرمایا اعظمی یہ پشاور ہے' لکھنؤ نہیں یہاں افسری جتلانے کے لئے وہی لہجہ اختیار کریں جو میرا ہے۔دوسرا امیدوار آیا تو میں نے اپنی طرف سے پورا زور لگایا اس کے جاتے ہی قاضی صاحب کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا اب کی بار کیسا رہا۔بولے Abit Better دس امیدوار آئے پوری

کوشش کے باوجود A Bit Better سے آگے نہ بڑھ سکا۔

ایک روز خلاف معمول دفتر شروع ہوتے ہی قاضی کا اشینوان کا سلام لایا۔ خدا خیر کرے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک سرخ وسفید طویل القامت نہایت متین و باوقار بزرگ تشریف فرما ہیں۔ قاضی صاحب ساتھ ہی مودب ہو کر بیٹھے ہیں۔ سامنے کرسی پر ایک صاحبزادے نہایت سعادت مندی سے بزرگوں کی گفتگو سن رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے تعارف کرایا۔ اور مجھے بتایا کہ یہ بزرگ بریگیڈیئر سرحسام الدین ہیں جو ریاست بھوپال کی افواج کے سالار اعلیٰ تھے نوجوان آپ کا بھانجہ ہے جسے وہ پروڈیوسر بنوانا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں لے جا کر ان کا انٹرویو لیجئے۔ میں نوجوان کو اپنے کمرے میں لایا۔ تعلیمی قابلیت صاحبزادے کی صرف انٹر تھی اس لئے میرا بھی کام آسان ہوگیا اور قاضی صاحب کا بھی۔ پروڈیوسر کے لئے گریجویٹ ہونا ضروری تھا میں نے قاضی صاحب کو خبر بلکہ خوشخبری دی۔ قاضی صاحب نے سرحسام الدین سے مقررہ تعلیمی معیار نہ ہونے پر معذرت کر لی۔ پھر بھی مجھے کہا کوئی راستہ نکالئے۔ ظاہر تھا تقرری صدر دفتر کو کرنا تھی۔ یہاں تو راستہ کیا پگڈنڈی بھی نہیں تھی۔ اسی دوران قاضی صاحب نے معزز مہمان کو مفت مشورہ دیا کہ ASI کے لئے تعلیمی لیاقت انٹر ہے۔ حسام الدین چلتے چلتے بولے کیا زمانہ آگیا ہے۔ گریجویٹ نہیں ہے یہ بھول جاتے ہیں کہ سرحسام الدین کا بھانجہ ہے۔ نہ ہوا برطانوی دور اسی طرح وہ ماضی کی یادوں میں گم بھانجے کے مستقبل کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ ہفتہ بعد دوبارہ تشریف لائے اور قاضی صاحب کو مطلع کیا کہ بھانجہ ASI بھرتی ہوگیا لیکن انہیں یہ افسوس رہا کہ ہم نے ان کی ذاتی سفارش نظرانداز کردی۔ بار بار کہتے رہے سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگوں نے مجھے اہمیت کیوں نہ دی۔ سچ ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

ریاض حسین چودھری

حمدِ ربِ جلیل

یارب ! ترے کرم کا رہے سر پہ سائباں
کشتِ دعا میں پھول کھلاتی رہے زباں
جگنو ہیں ' عاجزی کے ' سجود و قیام میں
ہیں بندگی کی ' میرے مصلّے پہ ' تتلیاں
مہکی ہے ' آج بھی لبِ تشنہ پہ چاندنی
اتری ہے ' آج بھی مرے آنگن میں کہکشاں
اس کو نقوشِ پائے نبیؐ کا ملے سراغ
کھویا ہوا خلا میں ہے صدیوں سے کارواں
پھر عافیت کی سبز ہوائیں چلا کریں
ڈوبی ہوئی ہیں خوف کے پانی میں بستیاں
موسم خزاں کا کب سے ہے بستی میں خیمہ زن
پھولوں سے بھر دے آدم و حوا کی جھولیاں
کب تک گرفتِ شب میں رہے گا چراغِ شب
کب تک رہے گا صبح کا منظر دھواں دھواں
تہذیب سر جھکائے کھڑی ہے زمین پر
چلتی ہیں ہر طرف ہوسِ زر کی آندھیاں
ہر موج خود کرے گی حفاظت ' مگر ہے شرط
حرفِ دعا بنیں کبھی کاغذ کی کشتیاں
جھک کر مری انا جہاں ہوتی ہے سربلند
وہ صرف تیرا در ہے خداوندِ دو جہاں
دے کر نبیؐ کا واسطہ مانگو دعا ' ریاضؔ
برسیں گی خوب آج بھی رحمت کی بدلیاں

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

دُعا بہ بارگاہِ ربّ العالمین

مولا ! میرے دیس مرے گلزار کو زندہ رکھنا
ہر رُت میں اس مٹی کی مہکار کو زندہ رکھنا
مولا ! اس سے دریا ' میداں سونا چاندی اُگلیں
ان باغوں ' ان کھیتوں ' ان اشجار کو زندہ رکھنا
مولا ! اُس نفرت سے بچانا ' جس سے چمن ہو ویراں
جس سے جگ جگ پھول کھلیں ' اُس پیار کو زندہ رکھنا
مولا ! جن پر اس گھر کی بنیاد رکھی تھی ہم نے
اُن جذبوں ' ان قدروں ' ان افکار کو زندہ رکھنا
مولا ! اپنا سارا تشخص ساری خوشبو جس سے
فکر و نظر میں اُس اجلے کردار کو زندہ رکھنا
مولا ! سچ کے ایک سفر پر نکلے سارے ساتھی
عزم کی جنبش ' قدموں کی رفتار کو زندہ رکھنا
مولا ! اس قلع کو سجانا چہرۂ جاں کی صورت
آنکھ کی صورت اس کے در و دیوار کو زندہ رکھنا
مولا ! اپنا دین ہے سورج ' اپنی ثقافت کرنیں
صبحِ وطن کے رخ پر اِن انوار کو زندہ رکھنا

عبدالعزیز خالد

نعتِ نبیؐ

شہِ خیل رُسل ، خیرُ البرایا — سراپا خیر جس کی ذات والا
ہُوا جو ہمکلامی سے مُشرف — وہ سیاحِ نواحِ "لی مع اللہ"
ہوئی جس زائر عرش بریں پر — شب اسریٰ کی سرّیت ہویدا
تھا جس کا منتظر صبح ازل سے — سریر قابَ قوسین او ادنیٰ
ہے پیش آہنگ روزِ واپسیں تک — جو اقوام واُمم کے کارواں کا
وہ آخر مہبط ناموس اکبر — وہ عاقب موردِ قولِ فاوحیٰ
کہے پروردگار پاک جس سے — تو مہر مرسلاں لاریب فیھا
جہانوں کے لیے اے جان عالم — تجھے رحمت بنا کر ہم نے بھیجا!
کرے موسوم و مبہم کو مُبرہَن — ہے جس پرآئینہ پنہاں و پیدا
کوئی جس کا نہیں ہست وعدم میں — حریف و ہمسرو انباز و ہمتا
ہوئے یکجا جمیع اوصاف جس میں — کریم الخیم محمودُ السجایا
وہ معیار و عیار حق و باطل — وہ میزانِ ومحک زشت و زیبا
ہے جو انجیل برنابا کی رو سے — مسیحائے بنی آدم مسیا
مساوات بشر پر زور دے کر — مٹایا جس نے فرق پست و بالا
کہے پرکہ سے اُمی بعد اُمی — وہ روح وراحت وریحاں سراپا
چڑھا جو آسماں پر اور نیچے — اتر آیا پئے اصلاح دنیا
وہ جب بولے تو بولے حکم رب سے — انا افصح ہے برحق اس کا دعویٰ
بساط کن فکاں جب سے بچھی وہ — تبھی سے کانَ صِدیقاً نبیاً
قضا جس سے کہے یاخالد الذکر — سدا اونچا رہے گا ذکر تیرا!
ہے فرماں بارگاہ لم یزل سے — ہمیں صَلّوا علیٰ ختم الرُسل کا
زمانے میں پیام اسکا کریں عام — ملے توفیق و تاب اس کی خدایا!
جو تھا مثل بشر بے سایہ لیکن — رہے سر پر ہمارے اس کا سایہ

بحقِ حُرمت خیرُ الخلائق
عطا کر ہم کو خیر دین و دنیا!

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

نعت

مداح ترا ، غیر کا کیوں دست نگر ہو
کیوں وقتِ ثنا ہاتھ میں جبریل کا پَر ہو

اے جانِ بہاراں تری برکت نہ اگر ہو
گلزار جہاں میں نہ شجر ہو، نہ ثمر ہو

صدیوں سے اسیر شب تاریک تھی دنیا
وہ مہر جہاں تاب جو نکلے تو سحر ہو

مٹی سے ترے شہر کی، تعمیر ہوئے ہیں
وہ قریہ ء خورشید ہو، یا چاند نگر ہو

بس ایک گزرگاہ ازل سے ہو ابد تک
بس ایک سفر ہو، وہ مدینے کا سفر ہو

کیا عزتِ سائل ہے کہ کشکول ہوں خود پُر
کیا شانِ عطا ہے کہ ہمیں بھی نہ خبر ہو

میں اس کو سرنامہء اعمال سجالوں
وہ لمحہ جو سرکار کی چوکھٹ پہ بسر ہو

رخسار کا کاغذ ہو اور اشکوں کی ہو تحریر
اس در پہ گزارش بھی بہ اندازِ دگر ہو

ہر ذرے سے لگتے ہوں جہاں سینکڑوں سورج
اُس شہر میں کیا حوصلہ اہلِ نظر ہو

وہ عرش تلک جائیں تو معراج ہو ان کی
ان تک بشر آ جائے تو معراج بشر ہو

گر ابرِ سخا ان کا سمندر پہ برس جائے
ہر سیپ کی کھلتی ہوئی مٹھی میں گہر ہو

ہر شخص کہے جائے، کہے جائے، کہے جائے
مکہ مرا مرکز ہو، مدینہ مرا گھر ہو

دو حرف ثنا عجز سے لکھ لوں تو بہت ہے
یہ کون سا موقع ہے کہ اظہار ہنر ہو

عاصی! یہ گزارش بھی ادب سے ہے تجاوز
اتنا جو کہا جائے کہ مجھ پر بھی نظر ہو

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

خیر البشرؐ

میں زندگی میں اسی کے نقش قدم پہ چلنے کی آرزو میں
ردائے غربت کے اوڑھنے میں نشاط سود وزیاں سے گزرا
میں اس کے لہجے کی نغمگی کو
خدائے برتر کی بے نیازی کا سرمدی اک ترانہ سمجھا
اسی نے خالق کے روح پرور تمام لفظوں تمام حرفوں
تمام نقطوں کو لوح محفوظ پر پڑھا ہے
اسی لئے وہ زمین مکہ میں عام لوگوں کی زندگی کا مزاج داں ہے
وہی تو امی لقب ہے جس نے
کسی کے آگے سوال رکھنا حرف سیکھا
وہی تو روز ازل سے اب تک ہمارے دل میں بسا ہوا ہے
ابد کی بے نام وسعتوں میں اسی کی فرماں روائی دیکھی
کہ وہ حبیب خدا ہے اس کی رضا خدا کی رضا رہے گی
میں زندگی میں اسی کے نقش قدم پہ چلنے کی آرزو میں
ردائے غربت کے اوڑھنے میں
نشاط سود وزیاں سے گزرا
میں اس کے لہجے کی نغمگی کو
خدائے برتر کی بے نیازی کا سرمدی اک ترانہ سمجھا
سراپا خیر عمل ہے اس کا ہر ایک لمحہ
میان ارض وسما جو گزرا

فضل حق

نعت

خوں کی شمعیں لئے سرکارؐ کے در جاؤں گا
آ ملے ساتھ چلیں گے میں جدھر جاؤں گا

عمر بھر آتش ہجراں میں بدن سلگا ہے
ان کا پرتو جو پڑے گا تو بکھر جاؤں گا

خاک کا جسم حضوری کے نہیں ہے شایاں
خاک جل جائیگی پر میں تو نکھر جاؤں گا

وہ گنہگار سے نفرت کو برا مانتے ہیں
میں تو عصیاں کے حوالے سے سنور جاؤں گا

گریۂ صبح مجھے پاک کرے یا نہ کرے
دل کے ویرانے کو سیراب تو کر جاؤں گا

حشر کی بات سناتا ہے جو بے ذکر رسولؐ
وہم ہے واعظ کم بیں کا کہ ڈر جاؤں گا

اسے معلوم نہیں ہے کہ مرے سر اوپر
سایۂ رحمتؐ عالم ہے گذر جاؤں گا

سید حبیب اللہ بخاری

نعت

زباں محوِ توصیف رب العلیٰ ہے
یہ دل خوگرِ مدحت مصطفیٰؐ ہے

ہے صبح و مسا ذکر جس کا زباں پر
وہ خیر الوریٰؐ سید الانبیاؐ ہے

فضائیں مدینے کی عنبر فشاں ہیں
کہ ہر سمت اک باب جنت کھلا ہے

ہے اکسیر میرے لئے خاک طیبہ
مرے مرض کی بس یہی اک دوا ہے

وہ ہر بات سنتے ہیں آہستہ بولو
یہاں زور سے سانس لینا خطا ہے

شفاعت کا طالب ہوں اے میرے آقاؐ
نگاہ کرم کی فقط التجا ہے

حبیب آؤ پہنچیں دیار نبیؐ میں
سنا ہے کہ موسم بڑا جانفزا ہے

محمود رحیم

نعت

میں تیرے نام کی سرداریوں میں رہتا ہوں
ہر اک لمحے کی سرشاریوں میں رہتا ہوں

ترے ہی اسم کی خوشبو ہے آس پاس مرے
میں تیرے ذکر کی گلکاریوں میں رہتا ہوں

مہک بکھیرتا رہتا ہے تیرا اسم کہ اب
ترے خیال کی پھلواریوں میں رہتا ہوں

تجھے ملی ہے خدا سے شفاعت کبریٰ
میں تیرے خلق کی دلداریوں میں رہتا ہوں

فقیہہ شہر حوالے نہ دے عذابوں کے
کہ میں مدینے کی رہداریوں میں رہتا ہوں

محیط ہے تری رحمت ہر ایک لمحے پہ
ترے کرم کی نگہداریوں میں رہتا ہوں

شاکر کنڈان

نعت

مری تقدیر کے رہنما آپؐ ہیں میری قسمت کے شمس و قمر آپ ہیں
وردِ لب، وردِ دل، وردِ فکر و نظر یا نبیؐ میرے شام و سحر آپؐ ہیں

آپؐ ہی کی نگاہِ کرم سے ہوئے حل مری زندگی کے سبھی مسئلے
اس نوائی پہ نازاں ہوں میں کس قدر میرے آقا مرے چارہ گر آپؐ ہیں

کوئی صورت بنے حاضری کی مری اب تو سینے میں دل بھی ٹھہرتا نہیں
میرے آقا مری ہر تڑپ، ہر جلن، ہر کسک سے سدا باخبر آپؐ ہیں

میں گنہگار ہوں، میں خطاکار ہوں، سب بجا ہوں مگر امتی آپؐ کا
سید المرسلینؐ، رحمتِ عالمیںؐ، شافعِ مذنبیں سربسر آپؐ ہیں

آپؐ کے دم سے آدم کو عظمت ملی آپؐ کے دم سے توقیرِ انسانیت
ساری مخلوقِ عالم میں رب کے قریں ساری مخلوق کے راہبر آپؐ ہیں

عرش ہاشمی

نعت

تیرگی میں تھا جہاں ڈوبا ہوا
نور وہ چمکا تو اندازہ ہوا

کس قدر انکی خوشی کی قدر ہے
جس طرف خواہش ہوئی ، قبلہ ہوا

رحمتوں کے اس پہ سب در کھل گئے
آپ کے در سے جو وابستہ ہوا

آپ کا سکّہ رواں ہے آج بھی
آپ نے کل بھی جو فرمایا ہوا

جب یہ فرمایا'' برے ہیں سب مرے''
میں برے لوگوں میں تھا اچھا ہوا

کل جو آقاؐ نے سکھائے تھے اصول
آج ہے ہر وہ سبق بھولا ہوا

اُسوۂ آقاؐ نظر انداز ہو ؟
''غیرت اہلِ چمن کو کیا ہوا''

عرش ہے اللہ کا بندہ وہی
جو بھی دل سے میرے آقاؐ کا ہوا

حسن زیدی

نعت

نورِ حق نورِ مبیں تابانیاں
ان کی آمد سے ملیں تابانیاں

مسکنِ سرور سے دکھلائے نہ کیوں
پھر یہ طیبہ کی زمیں تابانیاں

ساری دنیا کو دکھائیں آپؐ نے
ہو کے طیبہ میں مکیں تابانیاں

دیکھ کے حیراں تھے سب اسرا کی شب
فرش تا عرش بریں تابانیاں

جب بھی آیا دل میں آقا کا خیال
دیکھ لیں ہم نے وہیں تابانیاں

لے کے آئے ہیں خدا کی سمت سے
رحمت اللعالمین تابانیاں

گو غزل گوئی میں بھی روشن تھا دل
نعت سے لیکن ملیں تابانیاں

ان کے در سے تیرہ بختوں کو حسنؔ
کیسی کیسی مل گئیں تابانیاں

فارسی

تضمین بر غزل حضرت عثمان مروندی المعروف بہ حضرت لعل شہباز قلندرؒ

(تضمین نگار۔ بشیر حسین ناظم)

بنوشم جام آتش در حصار ناری رقصم — گہے مختار می رقصم گہے مختاری رقصم
بہ جمع مفتیانِ دیں قلندر واری رقصم — "نمی دانم کہ آخر چوں دم دیداری رقصم
ولے ناظم بریں ذوقے کہ پیش یاری رقصم"

اگر پیر مغاں گوید بحالِ زاری رقصم — بصد اعزازی رقصم بصد ایثاری رقصم
گہے ہشیاری رقصم گہے سرشاری رقصم — "تو ہر دم می سرائی نغمہ و ہر باری رقصم
بہر طرزے کے می رقصانیم اے یاری رقصم"

بدرگاہت رسیدہ ام ورائے چشم غمازاں — نمی بیند مرا مروے زفوج و جوق ہمرازاں
کجایم در چہ کارم ہم نمی دانند دمسازاں — "بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جاں بازاں
بصد سامان رسوائی سر بازاری رقصم"

علی الرغم وفائے دوستاں با دشمن آمیزی — بہ غربال تحقر جنس عشق عاشقاں بیزی
برائے کشتنِ عشاق تیغ غمزہ ہا بیزی — "تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خوں خواری رقصم"

جبینم سجدہ ہا پاشد بہ دہلیز ستمگارے — خورد زخمے روان من ز تیر عشوۂ یارے
بپیچد روح من از ظلم او چوں افعی و مارے — "اگر چہ قطرۂ شبنم نہ پاید بر سر خارے
منم آں قطرۂ شبنم بنوک خاری رقصم"

بیا، کن شوخ تر رنگ نیاز و آشنائی را — وظیفہ ساز بر پائے نگارے خوش ادائی را
تماشا کن بچشم دل طریق دلربائی را — "خوشا رندی کہ پامالش کند صد پارسائی را
زہے تقویٰ کہ من با جبہ و دستاری رقصم"

ز اصلم نوریم لیکن بجسم خاک مستورم — نشان فقر محبوبے امین شعلہ طورم
شہید تیغ ناظم ز انفصال اصل رنجورم — "منم عثمان مروندی کہ یار شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے و من برداری رقصم"

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

☆

آنکھ حجاب بن گئی بارگہ جمال میں
لوگ اٹک کے رہ گئے منظرِ خدوخال میں

گم ہوئے کتنے رابطے گردشِ ماہ و سال میں
اب ترا نام بھی نہیں حاشیہء خیال میں

اب کے تو قربِ دوست بھی مجھ کو خوشی نہ دے سکا
کتنے جواب گونج اٹھے خامشیء سوال میں

تاکہ بشر بشر رہے' تاکہ خدا نہ بن سکے
نقص ضرور چاہیے آئینہ کمال میں

شعلہ ء برق طور کا بن گیا خود بخود جواز
ہم کو بھی زعم دید تھا' آپ بھی تھے جلال میں

میرے لئے جہان میں اس سے بڑی خوشی ہے کیا
آپ شریک ہو گئے آ کے مرے ملال میں

خدمت دل نہ کر سکے چارہ گران بے ہنر
زخم لہو لہو ہوا کوشش اندمال میں

عاصی بے نیاز کو خواہش زر' نہ حرص جاہ
ایک فقیر باضمیر مست ہے اپنے حال میں

پروفیسر خیال آفاقی

☆

پھرتی ہیں در بدر لئے مجھ کو یہ میری خواہشات
تیری وہی عنایتیں ، میرے وہی تحفظات

اس کے ہزار مسئلے ، اس کا ہزار احتساب
جس کی بساط مشت خاک ، جس کی حیات بے ثبات

سمجھا تھا میں کہ خاک میں مل کے رہائی پا گیا
پھر بھی نہ مل سکی مجھے نام و نمود سے نجات

مژدہ سنا نہ اے صبا مجھ کو نئی بہار کا
دیکھے ہیں میں نے بارہا ایسے حسین حادثات

تو نے ہر ایک دور میں مجھ پہ کتاب کی رقم
میں نے ہر اک کتاب پر سو سو لکھے مقدمات

عشق کی بارگاہ میں شمس و قمر بھی سجدہ ریز
آقا و بندہ صف بہ صف کیسا نسب ، کہاں کی ذات

میرا فقیہہ و مقتدا عشقِ بزرگ و محترم
میری نماز سوزِ جاں ، اشکِ رواں مری زکات

میرے سخن میں تیری خُو ، میری غزل کا رنگ تُو
میرے ہر ایک شعر میں تیرا خیال تیری بات

مضطر اکبرآبادی

☆

میں تیرے چہرے کی سب سے پہلے کتاب دیکھوں
سحر کا گھونگھٹ اٹھا کے پھر آفتاب دیکھوں

مرے کسی خواب پر نہ ہو چھاپ دوسرے کی
ہو جس کی تعبیر تو فقط میں وہ خواب دیکھوں

لگے تری خلوتوں میں بھی جلوتوں کا میلہ
ہو کاش یہ بھی کہ خود کو میں باریاب دیکھوں

ترے تجسس میں دشت امکاں سے جب بھی گزروں
تو خود کو میں اک غبار پاؤں سراب دیکھوں

تری تمنا کے دائرے کا بنوں میں نقطہ
ترے محیط طلب میں خود کو حباب دیکھوں

تری جدائی کے مرحلے سے کبھی نہ گزروں
خدا کرے میں کبھی نہ یہ انقلاب دیکھوں

کنار دریا پہنچ کے یہ سوچتا ہوں مضطر
میں دل کو دیکھوں کہ موج کا اضطراب دیکھوں

اکبر حیدرآبادی (آکسفورڈ)

☆

دنیائے کرامات کے مسجود رہیں گے
شاہد بھی ہمیں اور ہمیں مشہود رہیں گے

انساں کی ذہانت کی کوئی حد نہیں لیکن
کچھ تجربے ایسے ہیں جو بے سود رہیں گے

جاری رہا گر سلسلۂ مشقِ تشدد
ہم کشتۂ غم لقمۂ بارود رہیں گے

پیروں پہ خود اپنے جو کھڑا ہو نہ سکے گا
سب راستے اس کے لیے مسدود رہیں گے

پامالیِ انساں کے خطاوار ہیں جو لوگ
تاریخ کی نظروں میں بھی مردود رہیں گے

فطرت میں مری جھوٹی اناؤں کے عناصر
نابود تھے نابود ہیں نابود رہیں گے

جنبش نہ اگر ہو پرِ پرواز کو اکبر
سب دائرے امکان کے محدود رہیں گے

مشکور حسین یاد

☆

اس حقیقت کو سمجھ لے تو سلامت ہے یہ جان
اپنے قامت میں اقامت میں قیامت ہے یہ جان

ہر کڑی دھوپ میں سائے کی سہولت ہے یہ جان
مہر ہے مُہر بہ لب ایسی مہورت ہے یہ جان

یہ پگھل جائے تو اک حشر بپا ہو جائے
منجمد ہو کے بھی سیّال صداقت ہے یہ جان

اس پہ چلتے ہی چلے جاؤ کہ شاداب رہو
جو کبھی ختم نہ ہو گی وہ مسافت ہے یہ جان

ہم اسے کس طرح محروم محبت رکھیں
امن ہی امن امانت ہی امانت ہے یہ جان

اتنا آساں تو نہیں اس کو احاطہ کرنا
حال کا مشغلہ آئندہ کی فرصت ہے یہ جان

اپنی تم جان سے ڈرتے تو بہت ہو مشکور
دیکھنا یہ ہے کہ کس شان کی ہیبت ہے یہ جان

☆

نہ صرف صورت غم روشنی میں رکھتے ہیں
ہم اپنی جان الم روشنی میں رکھتے ہیں

ہمارے قلب کو سمجھو نگاہ کو بوجھو
ہم اپنے لوح و قلم روشنی میں رکھتے ہیں

ہمارا پیار ہے چونکہ سب اہل دل کے لئے
بہائے لطف و کرم روشنی میں رکھتے ہیں

طرح طرح سے ہم آتے ہیں سامنے حق کے
طرح طرح سے قدم روشنی میں رکھتے ہیں

ہماری اس کے علاوہ نہیں کوئی پہچان
بس اپنے آپ کو ہم روشنی میں رکھتے ہیں

ہمارے اشکوں کی جاتی ہے تازگی ہر سو
ہم اپنی آنکھ کا نم روشنی میں رکھتے ہیں

ہم اپنا سب کو سمجھتے ہیں مونس و غم خوار
دکھوں کو کر کے بہم روشنی میں رکھتے ہیں

ہمیں سنو بھی پڑھو بھی کہ یاد ہم اپنی
متاع نطق و رقم روشنی میں رکھتے ہیں

سید رفیق عزیزی

☆

ہو اگر توفیقِ جرأت، عرصہء یک گام ہے
اس زمانے میں محبت بھی عجب اقدام ہے

کس کی آمد ہے کہ یہ جشنِ چراغاں عام ہے
زندگی کی شام ہے یا زندگیء شام ہے

آپ سے ملنے کی حسرت میں جیے جاتے ہیں ہم
آپ کے صدقے میں ہم پر زندگی الزام ہے

تنگ ہوتے جا رہے ہیں حلقہ ہائے زندگی
دوستو ! خوشیاں مناؤ عہد مرگ عام ہے

ہے مرے پیش نظر قانون ترتیب حیات
آ بھی جا اے موت تجھ سے بھی مجھے کچھ کام ہے

تم جہاں ہو آگہی دام خودی میں ہے اسیر
میں جہاں ہوں بے خودی بھی آگہی انجام ہے

زندگی کیا ہے ؟ فقط ہستی کی پستی کا سراغ
موت کیا ہے ؟ زندگی کا اک شعور خام ہے

آپ کے حسن توجہ سے یہ بے چارہ رفیق
خوش نظر، خوش طبع، خوش خو، خوش دہن، خوش کام

☆

اللہ اللہ یہ حجابِ حسن یہ حسنِ حجاب
کامیابیء نظر نکلی فریبِ کامیاب

تیرے عکسِ رخ سے روشن ہیں یہ ماہ و آفتاب
ہے گلستاں کی جوانی سے عیاں تیرا شباب

زندگی کی آرزو پھر ہے رہینِ اضطراب
پھر کسی بدمست کے ہاتھوں میں ہے جام شراب

ذرہ ذرہ پر نوازش-ذرہ ذرہ سے حجاب
ہر نظر جام تجلی ہر نظر ناکامیاب

دیکھو دیکھو، ٹھہرو ٹھہرو کیوں اٹھاتے ہو نقاب
ورنہ تم جانو جو ہو جائے جہاں میں انقلاب

اک اشارہ اور اس میں سیکڑوں عہد وفا
اللہ اللہ یہ تری سادہ نگاہی کا شباب

اب فنا ہی چارۂ سودائے ہستی ہو تو ہو
زندگی محدود اس پر رنج ہستی بے حساب

حیرت جلوہ کہوں یا جلوۂ حیرت کہوں
بزم عالم ہے ہمارے عالم دل کا جواب

بحر عالم میں وجود اپنا ہے ایسا اے رفیق
بہتے پانی میں اٹھے جیسے کبھی کوئی حباب

پروفیسر حسن عسکری

☆

دل میں روشن اس کی یادوں کا دیا رکھتا ہوں میں
بے خودی میں گھر کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں میں

شب گزرنے پر بڑھے گا اعتبار آدمی !
گرچہ صدیوں سے سحر کا آئینہ رکھتا ہوں میں

دیکھتا وہ بھی مری آنکھوں میں اک دن جھانک کر
خوابِ مستقبل جو آنکھوں میں سجا رکھتا ہوں میں

دونوں ہاتھوں سے لٹا کر حرف کی پونجی کھلا
ریزۂ دل کے سوا دامن میں کیا رکھتا ہوں میں

میں سخنور ہوں مرا لہجہ غزل کی آبرو!
معتقد سب کا، مزاج اپنا جدا رکھتا ہوں میں

اپنے محور سے نہ ہٹ جائے کہیں میری زمیں
اس لئے بھی خود کو مصروف دعا رکھتا ہوں میں

آنسوؤں نے پھر سرِ مژگاں چراغاں کر دیا
یاد اس بت کو دعاؤں میں سدا رکھتا ہوں میں

بند ہے سرچشمہ ایثار آخر کس لئے
رہنماؤں سے حسن شکوہ بجا رکھتا ہوں میں

☆

یہ ابتدا میں کسی کو بھی کیا خبر ہوگی
کہ جو بھی سعئ مسلسل ہے بے ثمر ہوگی

زکاتِ حرف نکالوں کہ مستحق کو ملے
مگر یہ شرم کہ پونجی تو مختصر ہو گی

ہر ایک شخص کے چہرے سے روشنی پھوٹے
اسی امید پہ اب زندگی بسر ہو گی

گھڑی اقامت حُسن عمل کی دور نہیں
وہ یوں کہ منزل آخر کبھی تو سر ہو گی

دعا کا معجزہ دنیا میں گر سلامت ہے
مرے چمن کی ہر اک شاخ بارور ہوگی

لہو جلا کے اندھیرے جو کاٹنا چاہے
اسی کے دم سے شب غم کی اب سحر ہو گی

جو بات کرنے سے پہلے بھی سوچنا سیکھے
اسی کی بات زمانے میں معتبر ہو گی

کسی بھی رُخ سے کٹے فصل گفتگو لیکن
ہماری بات کا حاصل تو چشم تر ہو گی

انور شعور

☆

کبھی من بیاباں چمن کی طرح تھا
یہ صحرا کسی پھول بن کی طرح تھا

ہمارے لئے دھوپ کا سائبان بھی
گھٹا کی طرح تھا، گگن کی طرح تھا

اسے آنکھ کھلتے ہی دیکھا تھا ہم نے
وہ سورج کی پہلی کرن کی طرح تھا

تری یاد کا لمحہ لمحہ زباں سے
مخاطب کسی ہم سخن کی طرح تھا

بنایا تھا مٹی سے ہم نے کوئی بت
جو بالکل کسی سیم تن کی طرح تھا

ہمارا تراشیدہ ایک ایک پتھر
کسی نرم و نازک بدن کی طرح تھا

شعور آج پردیس میں کس طرح ہے
وطن میں تو وہ بے وطن کی طرح تھا

کرامت بخاری

☆

سوئے منزل کوئی انجان چلا
قافلہ بے سروسامان چلا

ساعت ہجر میں پھر سانس رُکی
پھر تری یاد کا طوفان چلا

دیکھ کیا طوق و سلاسل گونجے
ساتھ قیدی کے جو زندان چلا

ضبط نے روک لیا ہاتھوں کو
ہم تو سمجھے تھے گریبان چلا

یہ خوشی ہے کہ مرا دشمن جاں
رفتہ رفتہ مجھے پہچان چلا

تیری اقلیم وفا میں اے دل
حسن کے نام کا فرمان چلا

پھر کوئی آہ لبوں تک آئی
پھر کہیں ظلم کا پیکان چلا

خالد یوسف (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

☆

روشنی کے قاصد بھی ظلمتوں میں چلتے ہیں
رہگذر میں اب دیکھو کب چراغ جلتے ہیں

کس کو ہمنوا سمجھیں کس کو راہبر جانیں
راستے کے ہر خم پر راستے بدلتے ہیں

صرف رنگ ونکہت ہیں گل اگر فقط گل ہوں
ہوں اگر نہ انگارے دل کہاں مچلتے ہیں

کتنے خوبصورت ہیں راستے جوانی کے
گام گام لغزش ہے لاکھ ہم سنبھلتے ہیں

ہم نہیں تو محفل میں زندگی نہیں، مانا
کیا مگر ہمیں کھو کر وہ بھی ہاتھ ملتے ہیں

فصل گل کے وعدوں سے دوستو نہ ہو مایوس
شب تو پل میں جاتی ہے دن تو دم میں ڈھلتے ہیں

کون لوٹ سکتا ہے قافلہ اجالوں کا
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

☆

سیاہیوں میں بھی امکانِ نور پڑھتے ہیں
ہم ایسے لوگ تو بین السطور پڑھتے ہیں

کسی کا خط وہ کبھی کھولتے نہیں لیکن
کھلا ہوا ہو اگر خط ضرور پڑھتے ہیں

ہر ایک موڑ پہ اپنے عمل سے ہیں جالوت
ہر ایک بزم میں لیکن زبور پڑھتے ہیں

نفاق دل میں مگر اسقدر صفائی پہ زور
کہ خط بھی آئے تو دھو کر حضور پڑھتے ہیں

یہ شیخ جی کی جہالت نہیں عقیدت ہے.
لکھا گیا اگر طُور طَور پڑھتے ہیں

ہمارا نام بھی جن پر گراں گزرتا ہے
ہمارے شعر برائے سرور پڑھتے ہیں

عدو پہ اسکے کرم. فی البدیہ ہیں خالد
کلامِ یار ہمیں بے قصور پڑھتے ہیں

سید صفدر حسین جعفری

☆

لو ہواؤں سے لگائے ہوئے چلتے رہنا
خشک پتوں کو اُڑائے ہوئے چلتے رہنا

جل رہا تھا جو کڑی دھوپ میں کل تک جنگل
رشکِ گلزار بنائے ہوئے چلتے رہنا

ڈھونڈتی پھرتی ہے کھوئے ہوئے اپنوں کو ہوا
دردِ دمساز بنائے ہوئے چلتے رہنا

میری اوقات کہاں کوچہ ء آرام کہاں
لاش خود اپنی اُٹھائے ہوئے چلتے رہنا

شامِ رخصت ہے مرے دل میں ترازو صفدرؔ
بارِ فرقت کو اُٹھائے ہوئے چلتے رہنا

ضیاء الحسن ضیاء

☆

کہیں دیکھے ستم ایجاد ایسے
ہوئی ہو اس قدر بیداد ایسے

بنا دیجئے فغاں آہنگ ہم کو
کوئی سنتا ہے کب فریاد ایسے

جنھیں پرواز کی جرأت نہیں تھی
پرندے ہو گئے آزاد ایسے

نہ ہو ایمائے چشمِ خاص جب تک
کوئی ہوتا نہیں برباد ایسے

جھکے ہیں اپنے عجزِ نفس سے ہم
قد و قامت میں ہیں شمشاد ایسے

میسر ہی نہیں آئینہ جن کو
ضیا اکثر ملے نقاد ایسے

صدیق شاہد

☆

آگ کو پھول کہے جائیں خرد مند اپنے
اور آنکھوں پہ رکھیں دید کے در بند اپنے

لاکھ چاہا کہ غم و فکر جہاں سے چھوٹیں
جامہ ء دل پہ یہ سجتے رہے پیوند اپنے

جن کو بخشا گیا اعجاز مسیحائی کا
صدف لب کی قسم رکھتے ہیں در بند اپنے

شہر میں دھوم مچاتی رہی کیا تازہ ہوا
ہم نے در وا نہ کیا ہم ہیں گلہ مند اپنے

سطح قرطاس پہ اترے نہ تری گلبدنی
کتنے عاجز ہوئے جاتے ہیں ہنرمند اپنے

مرحلہ طے نہ ہوا اہل تذبذب سے کوئی
جرمِ تشکیک سے بیٹھے رہے پابند اپنے

ایسا کچھ گردشِ دوراں نے رکھا ہے مصروف
ماجرے ہو نہ سکے ہم سے قلمبند اپنے

ہم تو مر جاتے غم دہر کے ہاتھوں شاہد
دشتِ آفاق میں ہوتے نہ اگر چند اپنے

فضل حق

☆

خلاف واقعہ ارماں کئے ہیں
شکست دل کے خود ساماں کئے ہیں

ہمیں گزرے ہیں دشت کربلا سے
ہمیں نے گلستاں ارزاں کئے ہیں

حساب ان کا ستاروں سے فزوں ہے
جو غم میں نے سپرد جاں کئے ہیں

دل و جان و جگر سے ہاتھ اٹھا کر
مقام آرزو آساں کئے ہیں

جئے ہیں وقت سے دست و گریباں
زمانے پر بہت احساں کئے ہیں

یہاں ساقی گری جس کو ملی ہے
اسی نے میکدے ویراں کئے ہیں

حکایات دل وجاں کے بہانے
یہاں ہم نے غم جاناں کئے ہیں

سنا آئے گی حال دل نبی ؐ کو
صبا سے وعدہ و پیماں کئے ہیں

سہیل غازی پوری

☆

جب اُتر آتا ہے مہتابِ فلک آنکھوں میں
زہر لگتی ہے ستاروں کی چمک آنکھوں میں

زخمِ بینائی بھرے بھی تو بھرے پھر کیسے؟
جب مرے لوگ چھڑکتے ہوں نمک آنکھوں میں

غم کے سیلاب کو تھمتے ہوئے دیکھا جب بھی
اشک خود آ گئے بن بن کے کمک آنکھوں میں

دل کے اندر کوئی دیوار گری ہے شاید
آج پھر اُبھری ہے پہلی سی دھمک آنکھوں میں

اُس نے دیکھا کہ نہ دیکھا مری جانب ہنس کر
بڑھتا رہتا ہے یہی سوچ کے شک آنکھوں میں

تیری باتوں کا یقیں اب نہیں آتا مجھ کو!!
تو جو خوش ہے تو دکھا اس کی جھلک آنکھوں میں

چوم لوں دل کی بصیرت سے کہ پھر برسوں تک
رقص کرتی رہے پھولوں کی مہک آنکھوں میں

دیکھنے کے لئے آنکھیں بھی ضروری ہیں سہیلؔ
یوں تو سو رنگ دکھاتی ہے دھنک آنکھوں میں

صابر عظیم آبادی

☆

زمانے کی روش کو خود پہ ہم طاری نہیں کرتے
لب و لہجہ کے پردے میں ریا کاری نہیں کرتے

کوئی کارِ جنوں ہو یا کوئی کارِ خردمندی
خلوص دل سے کرتے ہیں اداکاری نہیں کرتے

سبھوں کے ساتھ اپنا فیصلہ اک جیسا ہوتا ہے
کسی بھی مدعی کی ہم طرفداری نہیں کرتے

جنہیں انسانیت کا پاس ہوتا ہے وہ انساں سے
دکھاوے کے لئے اظہارِ غم خواری نہیں کرتے

وطن پر جان دے دیتے ہیں اپنی قوم کی خاطر
بنانے والے اس مٹی سے غداری نہیں کرتے

بڑے آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں بزم دنیا میں
یہ کیسے لوگ ہیں جانے کی تیاری نہیں کرتے

عزیز و اقرباء کی، باپ کی، ماں کی زمانے کی
ہمارے عہد کے بچے نگہداری نہیں کرتے

بچا ہے اس لئے دامن ہمارا تنگ دستی سے
ضرورت سے زیادہ ہم خریداری نہیں کرتے

مفادِ ذات ہوتا ہے جہاں پیشِ نظر صابرؔ
وہاں ظلِ الٰہی حد کوئی جاری نہیں کرتے

مشتاق شبنم

☆

نظارہ تشنگی کا کریں کس نظر سے ہم
رہ کر کنار بحر بھی پانی کو ترسے ہم

اس وقت اضطراب میں ہے ساری کائنات
مایوس پر نہیں ہیں ابھی تک بشر سے ہم

اس کے وجود سے کبھی غافل نہیں رہے
جس کو کبھی نہ دیکھ بھی پائے نظر سے

دشت ستم کی دھوپ میں گزری تمام عمر
نکلے تھے جانے کون سی ساعت میں گھر سے ہم

اُس عہد گشت وخوں کو زمانہ گزر گیا
ڈرتے ہیں اب بھی جنبش زنجیر در سے ہم

ہم اہلِ دل کا خاص ہے یہ فخرو امتیاز
کچھ زخم ساتھ لائے ہیں گزرے جدھر سے ہم

واقف ہوئے ہیں منزل شہر جمال سے
شبنم گزر کے مرحلہ سنگ دسر سے ہم

شارق بلیاوی

☆

جو پڑھی جائے نہ اس تحریر سے رشتہ ہے کیا
زندگی تو ہی بتا تقدیر سے رشتہ ہے کیا

خواب تو رکھتے نہیں اپنا وجود معتبر
خواب تو بس خواب ہے تعبیر سے رشتہ ہے کیا

بے تکلف مجھ سے کیوں ہوتی ہے محو گفتگو
تجھ سے الفت ہے تری تصویر سے رشتہ ہے کیا

منتظر رہتی ہے ہر تعمیر نو تخریب کی
کیا کہوں تخریب کا تعمیر سے رشتہ ہے کیا

لذت زخم تمنا چاہتا ہے بار بار
جانے میرے دل کو تیرے تیر سے رشتہ ہے کیا

عشق ہے تو عشق ہی کی آگ میں جل جاؤ تم
اے پتنگو شمع کی تنویر سے رشتہ ہے کیا

اس نے پہنائی تھی شارق سو بھرم رکھتا ہوں میں
ورنہ میرے پاؤں کو زنجیر سے رشتہ ہے کیا

محمود رحیم

☆

غم جو ہم تیرے سبب کھینچتے ہیں
کھینچتے ہیں پہ عجب کھینچتے ہیں

کب گریزاں تھے ترے درد سے ہم
ہاں بعنوان طرب کھینچتے ہیں

پہلوئے یار سے اک نشہء جاں
روز تا وسعت شب، کھینچتے ہیں

سرسری رنج نہیں کھینچتے ہم
فرصتیں ملتی ہیں تب کھینچتے ہیں

از رہ طنز جو خیرات کرے
اس سے ہم دست طلب کھینچتے ہیں

حدِ امکاں میں بہم جتنے رہے
زاویے دید کے سب کھینچتے ہیں

قربت وصل بھی اک ہجر لگے
درمیاں حدِ ادب کھینچتے ہیں

حسیر نوری

☆

اب آسمان پہ رکھئے تہہ زمیں رکھئے
نشاں جہاں نہ ہو میرا قدم وہیں رکھئے

جہاں جہاں رہ تخلیق میں اندھیرا ہو
چراغ فکر جلا کر وہیں وہیں رکھئے

تموج یم حالات کا تقاضہ ہے
عمل کو سطح پہ حسرت کو تہہ نشیں رکھئے

بلند لاکھ سہی آستانہء عظمت
قبول دل نہیں کرتا تو سر نہیں رکھئے

پناہ ڈھونڈ رہا ہے اِدھر اُدھر موذی
بچا کے اپنے گریبان و آستیں رکھئے

حرم ہو دیر ہو بتخانہ ہو کہ راہ گزر
جہاں پہ خود ہی جھکے دل وہیں جبیں رکھئے

یہ دور جلوہ گری کا ہے باوجود اس کے
حسیر دل کہیں اپنا نظر کہیں رکھئے

عقیل دانش (لندن)

☆

ہمارے واسطے آنکھوں کو آپ نم نہ کریں
حضور ۔ یہ ! بس ہم پہ یہ کرم نہ کریں

کہاں ہے گردشِ ایام دیکھ ہم نہیں وہ لوگ
کہ ٹوٹ جائیں مگر سر کو اپنے خم نہ کریں

جہاں میں آج بھی کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم
جو دل پہ گزری ہے اپنے اسے رقم نہ کریں

برائے عزم و عمل وقت کی صدا یہ ہے
گزر گئے ہیں جو لمحات ان کا غم نہ کریں

یہ دور وہ ہے کہ حق گوی تو کجا دانش
ولی ہیں آپ اگر مدحتِ ستم نہ کریں

☆

کرب کم مائگاں بیاں کیجے
اس زمیں کو بھی آسماں کیجے

دھند میں ہے ابھی تو مستقبل
کیا غمِ عمرِ رائیگاں کیجے

غمِ ایام کے اندھیروں میں
یاد کو ان کی کہکشاں کیجے

آنکھ سے کہیے داستاں دل کی
بے زبانی کو اب زباں کیجے

آج پھر دل اداس ہے دانش
آج پھر ذکرِ مہ و شاں کیجے

محمد اویس جعفری (سیاٹل ۔ امریکہ)

☆

مصحفِ رخ سے دن کو روشن زلفِ دوتا سے رات کرو
شہد لبوں کو جنبش تو دو کوئی تو میٹھی بات کرو

بات کرو اس جانِ غزل سے شعر و سخن کے پردے میں
لفظوں سے اصنام تراشو فکر تشبیہات کرو

اُس کا گُل سے خوشبو لاؤ اُس آنچل سے رنگ حیا
شیشہء جاں سے مے چھلکاؤ آنکھوں سے برسات کرو

عارض تاباں راہنما ہو زلف معنبر سایہ ہو
حضرت دل منزل آساں ہو ایسی کوئی بات کرو

برسوں کی بیتابیء دل کا بس یہی لمحہ حاصل ہے
آئے ہو کچھ دیر تو بیٹھو کچھ تو خدارا بات کرو

وہ بت کافر رام ہو کیسے تم شاعر وہ پتھر دل
منت مانو ، نذر چڑھاؤ، صدقہ دو ، خیرات کرو

نیل ہی خود ساحل بن جائے آگ گُل و گلزار بنے
اہلِ جنوں پھر عقل پہ یورش عقل کو پھر تم مات کرو

اک دل کے کہنے میں آکر تم نے غزل کہہ ڈالی اویس
میری سنو صوفی بن جاؤ فکر حمد و نعت کرو

جعفر بلوچ

☆

کیوں چپ ہو لب کھولو
بولو کلیو بولو

صدیوں سے اک شب ہے
صبحو گھونگھٹ کھولو

آنسو سوکھ نہ جائیں
میلے منظر دھولو

اے سیمرغ سرشتو
اپنی طرف پر تولو

کر کے ستم تم خوش ہو
اچھا تم خوش ہو لو

ہم بیداد طلب ہیں
اے بیداد گرو، لو

جن کی مانگ نہیں ہے
وہ موتی مت رولو

وہ اونچا سنتے ہیں
جعفر اونچا بولو

ارشد محمود ناشاد

☆

محیطِ عرصۂ امکاں ہے قصہ خوانیٔ ہجر
ہوا ہے کون شناسائے بیکرانیٔ ہجر

خدا کرے کہ جنوں کو کبھی زوال نہ ہو
وگرنہ کس کو ہے یاں تاب میزبانیٔ ہجر

دیارِ جاں میں بھڑکتا رہا ہے شعلۂ شوق
رہی ہے سایہ فگن ہم پہ مہربانیٔ ہجر

عجیب عرصۂ بیگانگی کی زد میں ہیں
کریں تو کس سے کریں شکوۂ گرانیٔ ہجر

اسیرِ وصل رہے ہیں خیال و خواب ان کے
منا رہے ہیں جواب جشن کامرانیٔ ہجر

تمہارا ذکر کہ اب بھی لبوں کی زینت ہے
ہمارے پاس بچی ہے یہی نشانیٔ ہجر

باقر نقوی (انگلستان)

☆

لطفِ حبیب کی غزل، پُرسشِ حال کی غزل
خامۂ لنگ آج لکھ کوئی کمال کی غزل

قصد اگر بُکا بھی ہے لکھ کوئی شعرِ طرح دار
مرثیہ ہجر کا نہیں، زخمِ وصال کی غزل

اس میں نہ روحِ عصر ہے اس میں نہ دردِ وقت ہے
کیسے حروف سے لکھی کیسی زوال کی غزل

عشق کا ذکر تھا کہاں، عرضِ وصال تھی فقط
جب بھی لکھی تو بس وہی ایک سوال کی غزل

کیسا یہ طرزِ نقد ہے، بانٹ دیا ادب کو بھی
گرم غزل جنوب کی، سرد شمال کی غزل

لا کوئی موئے ہفت رنگ، جمع مہکتے حرف کر
باقرِ زر نویس لکھ اُس کے جمال کی غزل

ڈاکٹر مظہر حامد

☆

جھلملاتے ہوئے دیپک کو ہوا میں رکھا
زیست تو نے ہمیں کس دشت بلا میں رکھا

تم نے چہرے پہ جو ڈالی ہے محبت کی نقاب
جان کر ایک قدم لغزشِ پا میں رکھا

بے رخی کو بھی ترا حسن کرم ہی سمجھا
عشق نے ہم کو اسی بیم و رجا میں رکھا

جان کر ہم نے کیے سجدوں پہ سجدے پیہم
ورنہ کیا تھا ترے نقش کف پا میں رکھا

غیر ممکن ہے کہ بجھ جائے ترے غم کا چراغ
دیپ ہم نے جو جلایا وہ ہوا میں رکھا

تو نہ ہوتا جو مرے درد کا درماں تو یہاں
اور کیا تھا مرے ہونٹوں کی دعا میں رکھا

میں نے صرف ایک دعا کی تھی پئے عرض وفا
مجھ کو بے جرم و خطا تو نے سزا میں رکھا

زور کتنا ہے ہواؤں میں یہ ہم بھی دیکھیں
دیپ جلتا ہوا ہم نے بھی ہوا میں رکھا

ع۔ق۔آور

☆

شاعری سوزِ جگر، خون جگر مانگتی ہے
اپنی شب خیزی کے نالوں میں اثر مانگتی ہے

دامن عِشق پہ چمکے جو مثالِ گوہر
بھیگی پلکوں پہ وہ تاثیر ہنر مانگتی ہے

ہجر اگر رات کی باہوں میں ہو خوابیدہ غم
صبح دم اس سے بھی یہ تازہ خبر مانگتی ہے

کوئی منظر جونہی الفاظ کے پیکر میں ڈھلے
یہ فقط دستِ ہنر ، حسن نظر مانگتی ہے

کرتی رہتی ہے ہر اک بات میں دخل اندازی
پھر ہر اک شغل کا اپنے یہ ثمر مانگتی ہے

اپنی بیداری کی تصدیق کو یہ آخر شب
خون میں ڈوبے ہوئے دیدۂ تر مانگتی ہے

فطرتِ شعر ہے آزاد روی کی مظہر
وِرثۂ حضرت حسانؓ مگر مانگتی ہے

ہونے دیتی نہیں آور یہ جنوں کو بیباک
عشق کے حق میں نظر اور خبر مانگتی ہے

نورالزماں احمد اوج

☆

مرے ظلمت کدے میں بھی شبِ مہتاب آئی تھی
مری بیتاب آنکھوں میں وہ بن کر خواب آئی تھی

بہت بن ٹھن کے آئی تھی وہ میرے حجلہء غم میں
مری خاطر وہ پہنے اطلس و کمخواب آئی تھی

مری گردن میں باہیں ڈال کر مجھ میں سمانے کو
بڑی بے چین آئی تھی بڑی بیتاب آئی تھی

ہواؤں سے مہک آنے لگی تھی لالہ و گل کی
وہ اس انداز سے لے کر رُخِ شاداب آئی تھی

تلاطم خیز تھا اس کی جوانی کا ہر اک پہلو
مری خاموشیوں میں بن کے وہ اک خواب آئی تھی

یکا یک میکدے کے در کھلے تھے اس کی آمد پر
نگاہ مست میں لے کر شراب ناب آئی تھی

زمانہ ہوگیا اے اوج اس کی یاد دل میں ہے
وہ اک شعلہ بدن جو صورتِ سیماب آئی تھی

سہیل اختر

☆

سلگ اُٹھے جدائی کے شرر آہستہ آہستہ
صبا بن کر مرے دِل میں اُتر آہستہ آہستہ

قفس کا در اچانک کُھل بھی جائے دوستو لیکن
اسیروں کے کھلیں گے بال و پر آہستہ آہستہ

ابھی تو دشتِ غم میں خار ہی چننے ہیں پلکوں سے
کسی منزل پہ مہکے گی نظر آہستہ آہستہ

ابھی تو آرزو بس ہمکلامی تک ہی پہنچی ہے
کریں گے ہم ترے دل میں بھی گھر آہستہ آہستہ

نجانے دشتِ غم میں کس کٹھن منزل کا راہی ہوں
کہ رخصت ہو گئے سب ہمسفر آہستہ آہستہ

اگر تنہائیوں کی دھول سی اُڑتی رہی اس میں
تو بن جائے گا یہ دِل بھی کھنڈر آہستہ آہستہ

انہی اشکوں کی تابانی سے آخر ضوفشاں ہو گی
شبِ ہجراں کے آنگن میں سحر آہتہ آہستہ

عبدالعزیز خالد

رباعیات

اک مُشتِ غبار میں --- فرومایہ و دُوں
اوقات ہے کیا میری کہ بات اسکی کروں
اے وہ کہ جوہر روز نئی شان میں ہے
معمول ہے جس کا عملِ کُن فیکوں

☆

بیٹی کی زباں سے جو سنا وا اَبتاہ
بولے سکرات میں شہ دین پناہؐ
لا کربَ علیٰ اَبیک بَعدَ الیوم
ہلکان نہ کر خود کو پڑھ اِنا للّٰہ

☆

ہر مرد خدا پرست کو حکم
خدا جادِ لھُم بِالّتی ھِیَ اَحسَن کا
از بسکہ نہیں پسند قدرت کو فساد
اِصلاح'' بَینَ النّاس اس کی ہے رضا

☆

ہے ملّت و اتحاد ہی رازِ بقا
جو بھی ہے وہ اختلاط ہی کی ہے عطا
پیوند ہوں جب خیال باہم دیگر
ہوتا ہے طلوع ان سے عرفان نیا

پڑنے دے نہ مدھم اس کی جوت اس کی جلا
انمول ہے نازک ہے بہت کام اس کا
کر مصقلہء ذکر سے صیقل دل کو
غسل اشکوں سے دے اس کو زنگ اس کا چھڑا!

☆

اک منطقہء حارّہ ہوا ہم کو عطا
ساتھ اس کے یہ انتباہ کانوں میں پڑا
کرتے ہیں جو گرمی کی شکایت ان سے
قُل ! نارُ جھنّم اَشَدُّ حَرّا!

☆

دلدادۂ صحبتِ سبو و ساقی
اس پر خود کرتا تھا عمل گو کم ہی
مے کش کو مگر کرے نصیحت خیّام
تھوڑی پی کبھی کبھار پی چھپ کر ☆ پی!

☆

ہم اہل قناعت ہیں نہیں بیش طلب
رکھتے ہیں سدا مدّنظر حدّ ادب!
سب مدعیوں کا گرچہ دعوٰی ہے یہی
پُتلے مگر آز و حرص کے سب کے سب!

☆ مصرعہء خیّام ''گہہ گہہ خورد' کم کم خورد' پوشیدہ خورد'' (ادارہ)

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی

قطعات

وقت کی فطرت دُرشتی دل مرا ژولیدہ ہے
کون اس کا حل نکالے مسئلہ پیچیدہ ہے
لمحۂ قربت کو تیرے کب میسّر ہے دوام
لمحہ قربت بھی تیرا موئے آتش دیدہ ہے

ہم فکر ہے باقی نہ ہم آواز و ہم احساس
کس درجہ الم ناک ہے اس کال کی صورت
پُر مایہ ملل جانب مہتاب رواں ہیں
استادہ ہیں ہم راہ میں کنگال کی صورت

رہتے ہیں وہی لوگ المناک زیادہ
ملتا ہے جنہیں جوھر ادراک زیادہ
سبزے کا تصور بھی ہے صحرائے وفا میں
اس دشت میں اڑتی ہے مگر خاک زیادہ

عشوۂ بالیدگی ہر شے کی زیبائی میں ہے
کون آخر محو اتنا عالم آرائی میں ہے
ارتفاع بحر سے بدلی ہے وضع ظاہری
ورنہ اک دشت لق و دق اسکی گہرائی میں ہے

تیری شائستہ لباسی سے میں عریاں ہو گیا
میری عریانی مجھے ملبوس پہناتی رہی
وقت کے ظالم طمانچے پے بہ پے پڑتے رہے
بے حمیت زندگی رخسار سہلاتی رہی

سوال تھا کہ مکمل بشر ہوا کہ نہیں
خرد نے ایک طمانچہ دیا کہا کہ نہیں
کہا نہ تھا کہ نہ کر رنگ و نسل کا پرچار
زمیں یہ خلق خدا کا لہو بہا کہ نہیں

بکھرا ہوا ہوں بربطِ غم کی صداؤں میں
مشکل ہے ڈھونڈنا مجھے رنگیں نواؤں میں
بیٹھا نہیں ہوں سایۂ اغیار میں کبھی
ساکن ہوں اپنے نخل جلالت کی چھاؤں میں

نہ ملا نشاط ہستی کا سراغ عمر بھر میں
ہے فقط امید فردا کا چراغ میرے گھر میں
میں طلسم روز و شب سے نہ ہوا کبھی مسخر
مری صبح رات سے ہے، مری رات ہے سحر میں

دل جلوں سے مست ہو یا مرد فرزانہ ملے
کچھ نہ کچھ بے باک ہو محفل میں مردانہ ملے
دل تمنائی کہ پھر اک دلبر آہو خرام
دن ڈھلے ملتا رہے اور وہ بھی روزانہ ملے

مستقل طاری ہے بینائی پہ وسعت کا ہراس
تل برابر بھی وگرنہ وسعتِ صحرا نہیں
جنبش ابرو سے شق ہوتے ہیں جسکے مہر و ماہ
تو نے ایسے آدمی کا خواب تک دیکھا نہیں

مشتاق شبنم

رباعیات

سورج کی تپش سے بھی پگھلتے دیکھا
برفاب کی ٹھنڈک سے بھی جلتے دیکھا
تھا کاسۂ دل جن کا یقیں سے خالی
افسوس کف دست ہی ملتے دیکھا

دیوار پہ جو لکھا ہے پڑھتا ہوں میں
مفہوم و معانی کو سمجھتا ہو ں میں
اے دوست پس پردہ کوئی حشر نہ ہو
امروز کی خامشی سے ڈرتا ہوں میں

ہر آن تذبذب سے گزرتے کیوں ہو
شبہات کی پرچھائیں سے ڈرتے کیوں ہو
ایقان و عزائم میں نہیں کھوٹ تو پھر
سچ بات کہو کہنے سے ڈرتے کیوں ہو

جلتا ہے سر شام درندوں کا چراغ
لبریز مۓ خوں سے ہے رندوں کا ایاغ
واللہ کہ سفاک ہے بے رحم ہے وقت
دیتا نہیں انسان کی عظمت کا سراغ

ضیاءالحسن ضیاء

ہائیکو

سورج ڈھلنے سے
کتنے دل جل اٹھتے ہیں
دیپک جلنے سے

☆

بہتے جھرنوں کو
کیسے کوئی سمیٹے گا
اڑتے پتوں کو

☆

آنکھوں میں جھانکو
دور ہو کیوں چپ چاپ کھڑے
دریا میں اترو

☆

کیا پڑھنا اخبار
سرخی ہی سے ظاہر ہے
جھوٹ کا کاروبار

☆

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

ایک آرزو۔ایک دعا

تشکیل وطن کو ہو چکی ہے
اب نصف صدی سے کچھ زیادہ
تشکیل کے بعد جو ہے تعمیر
تم اُس کا کرو گے کب ارادہ
کیسے یہ وطن ہوا تھا حاصل
اس قصے کا کیا کروں اعادہ
طوفاں کے مقابلے میں ہم تھے
کہسار کی طرح ایستادہ
ایثار و جہاد و عزم کے ساتھ
راہِ مقصد میں پانہادہ
ہم اپنے لہو میں ڈوب کر بھی
طے کرتے رہے عمل کا جادہ
لیکن تشکیل سے گزر کر
توفیق عمل زدست دادہ
ہم بھول گئے وہ عہد تحریک
نشّہ نہ ہوا بقدر بادہ
اب ہم پہ وہ بے دلی ہے طاری
خستہ ، مغموم ، سرفتادہ
زندہ ہیں غبارِ راہ بن کر
منزل ہے ، نہ قافلہ ، نہ جادہ
بھیڑوں کی طرح ہیں منتشر ہم
بے سمت رواں ہیں ، بے ارادہ
اغیار ہماری گھات میں ہیں
نازل ہو کوئی بلا مبادا
اے خطہ ء پاک کے مکینو
ہے عرض مری بہ حرفِ سادہ
جاگو نہ ، نہیں ہے خواب کا وقت
اب کام کرو بہت زیادہ
سائنس ہو یا کہ ٹیکنالوجی
کرتے رہو ان سے استفادہ
مثبت قدروں کا چہرہ چمکے
سچ پر نہ ہو جھوٹ کا لبادہ
برتاؤ ہو بھائیو کی مانند
بن کر رہو ایک خانوادہ
یہ دیس ہو گلشنِ مساوات
مفلس ہو کوئی نہ شاہزادہ

ہم وحدتِ بیکراں میں ڈھل جائیں
نظریں ہوں وسیع ، دل کشادہ

عبدالعزیز خالد

یہ کونسی صدی ہے

یہ کونسی صدی ہے کس کو یہ علم ہے
ہم سے مرورِ وقت کی پوچھو نہ کوئی بات
ہم کھا چکے ہیں معرکۂ ارتقا میں مات
دیکھو ہمیں کہ ہم نئے اصحاب کیف ہیں

بعد مسیحؑ احمدؐ مختارؑ کا ظہور
ہو کر بھی گرچہ سینکڑوں صدیاں گزر چکیں
ہم ہیں ابھی زمانۂ قبل مسیح میں
ہنگامہ ہائے فکر و فن نو بنو سے دور
جذبات سے لدے پھندے بیگانۂ شعور
حسن عمل سے میل نہ فکر جمیل سے
قائل نہ ہم کبھی ہوئے بحث و دلیل سے
سرشتہ اختیار کا ہاتھوں سے جب چھٹا
تب سے بھٹک رہے ہیں سواء السبیل سے
نعم البدل کی مانگ تھی بئس العوض ملا
نادیدنی کو دیکھیں سنیں ناشنیدنی
ہم پر زمین اپنی فراخی کے باوجود
پاداش ریو و ریمنی میں تنگ ہو گئی

یہ کشور حسیں یہ خداداد مملکت
ہم کو عزیز ہے دل و جاں سے مگر ہے خوف
نام اس کا کٹ نہ جائے کتاب حیات سے
لوح جہاں سے نقش ہو اس کا نہ مُندرس
یہ قلعۂ مراد زمیں بوس ہو نہ جائے
یہ شاد باد خطۂ افسوس ہو نہ جائے

دل داغ داغ اور جگر لخت لخت ہے
سوگند عصر، عصر رواں ہم پہ سخت ہے
ڈر ہے کہیں یہی نہ گھڑی ہو زوال کی
پت جھڑ سے لٹ نہ جائیں گلستاں کی رونقیں
جاتی ہوئی بہار کو اے کاش روک لیں

کھونے کا ایک وقت ہے پانے کا ایک وقت
ڈھانے کا ایک وقت بنانے کا ایک وقت
زنہار ہو نہ رفع عطش آب شور سے
برباد ہو وہ بیج جو اوسر زمیں پڑے
نامستجاب حرف دعا آرزو سراب
دے فائدہ دعا نہ نزول بلا کے بعد

بست و کشاد ملک تصرف میں جن کے ہے
خرمستیاں کریں جو سیاست کے نام پر
پیروں میں روندتے ہیں حقوق العباد کو
انصاف ان کے کیش میں اک جنس زرخرید

عائد نہ فرد جرم کسی با اثر پہ ہو
ہو بھی تو چھوٹ جائے پلک مارتے نلوہ

یہ خیرہ سر خواص ہیں بالائے احتساب
قانون کے پرخچے اڑاتے ہیں بر ملا
ملکی خزانہ مال غنیمت بنا ہوا
آلودگی سے ہاتھ ہر اک کا سنا ہوا

شہ خرچیوں سے ملک کے بخیئے ادھڑ گئے
کتنے ہی رستے بستے گھرانے اجڑ گئے
کتنے شریف بتھے سے اپنے اکھڑ گئے
منصوبے نفع عام کے کتنے سکڑ گئے

بے دست و پا عوام لکد کوبِ حادثات
جنجال ڈال ڈال ہیں آفات پات پات
ہر سینہ نوک دشنہء غم سے فگار ہے
بھرتے ہیں لوگ اوجھ مگر جھینک جھینک کر
چلتے ہیں لے کے بوجھ مگر رینگ رینگ کر
بد نظمی و گرانی و رشوت کے ہول سے
بے چارگاں کو سانس بھی لینا محال ہے
بالا اگر ہے بول تو زردار کا فقط
بے زر سفید پوشوں کا جیوڑا نکل گیا
نظم و نسق کے نام پہ پھیلی ہے ابتری
آئین نو کی دین ہے ہم کو انارکی

تقصیر اس میں گردش ایام کی نہیں
ہم کو نہ آئی نعمت خود اختیاری راس
قدرت کرے کسی کی نہ خوش فہمیوں کا پاس
ہر چند دیر گیر مگر سخت گیر ہے
یہ قبض وبسط سنت رب قدیر ہے

شاعر ہوں میرا عہد وفا ہے عوام سے
یعنی لسانِ صدق ہوں ان کا ہوں ترجماں
گزرے ہوئے زمانے کا بھی ہوں میں نوحہ خواں
اور آنے والے دور کا بھی زمزمہ سرا
مشکل ترین کام ہے دنیا میں سوچنا
اس سوچنے کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنا
لفظوں کو پھر بنانا تپ دل سے تیر جست
دیکھوں حقیقتوں کو میں عبرت کی آنکھ سے
واجب جو واجبات ہیں ان کو کروں ادا
جو واجب الوجوب ہے اس کی کروں ثنا!

یہ پاک سرزمیں ہمیں کتنی عزیز ہے
قدرت کا یہ عطیہ اک انمول چیز ہے
یارب ! اس آستاں کے مکینوں کی خیر ہو
ریگ رواں پہ چلتے سفینوں کو خیر ہو
شنگول و شوخ وشنگ حسینوں کی خیر ہو

سید رفیق عزیزی

چاندنی

عصمت مآب پردہ نشینوں کی خیر ہو
سجدوں کی مُہر کردہ جبینوں کی خیر ہو
ہم سے فقیر گوشہ نشینوں کی خیر ہو

یارب نہ ہو اعادۂ تاریخ اندلس
کانوں میں پھر نہ ''آخری آہِ☆عرب'' پڑے
حبل متیں جو کھو چکے ہو اس کی باز یافت
مل جائے پھر سے کاش کہ اپنی ہمیں شناخت

یہ عجز و انفعال وانابت کا وقت ہے
پچھلا پہر ہے شب کا اجابت کا وقت ہے
جب تک ہے زندگی نہ ہو امید منقطع
ہر ابتلا کو ہمت و توفیق سے سہیں
جب تک ہے برقرار دم زندگی ' رہیں
خائف نزول قہر الٰہی سے ساتھ ہی
امید وار رحمتِ پروردگار کے !
ختم خزاں کے آمد فصل بہار کے!

یاد ہے تم بھی کبھی تھے زینت آغوش عشق
اللہ اللہ وہ معنبر دن ' معطّر چاندنی

پچھلی راتوں کو مرے رونے پہ ہنس دیتے تھے تم
میں ہی کیا ، تارے ہی کیا ، روتی ہے جس پر چاندنی

آ کہ ایسے وقت میں تجھکو صحیفہ جان لوں
''چاند ہے پروردگار اور ہے پیمبر چاندنی''

پاک دا مانی ترے مستوں کی دیکھا چاہیئے
آرہی ہو جیسے کوثر میں نہا کر چاندنی

مہکی مہکی سی تمنّا بہکے بہکے سے خیال
دے رہی ہے آج پھر ساغر پہ ساغر چاندنی

سوچتا یہ ہوں کہ یہ تیرا ہے یا میرا خیال
جو برس پڑتا ہے ہر اک شے پہ بن کر چاندنی

ذرہ ذرہ کو عطا کی خلعتِ انوار قدس
صد صلوٰۃ اے ماہتاب اللہ اکبر چاندنی

ان کے آجانے سے ایسا بھی ہوا اکثر رفیق
میری نظروں میں رہی ہو جیسے دن بھر چاندنی

El ultimo Suspiro del Moro ---- The Moor's last Sigh! ☆

جمیل یوسف

کیا کوئی ایسی بھی صورت ہے؟

کیا کوئی ایسی بھی صورت ہے کہ یہ آج کا دن
یہ حسیں وقت یہ من موہنا پل
یہ سرکوہ بھٹکتا ہوا بے کل بادل
یہ گھڑی بانٹ رہی ہے جو سکوں کی دولت
یہ سماں جس سے میسر ہے نظر کو راحت
یہ درو بام سے لپٹی ہوئی دُھوپ
دن کے ڈھلنے کا یہ رُوپ
دن کی دہلیز پہ یہ شام کی آہٹ کا گماں
مجھ کو ٹھہرا ہوا لگتا ہے جہاں گزراں
میں اکیلا ہوں مگر
اپنی تنہائی کا کچھ بھی مجھے احساس نہیں
اس سمے دل میں ہے اک لذتِ بےنام کا کیف

کیا کوئی ایسی بھی صورت ہے کہ یہ آج کا دن
یہ حسیں وقت یہ من موہنا پل
میرے آنگن میں ذرا رُک جائے
وقت کا سیل رواں
اس حسیں پل کو نہ لے جائے کہیں
کیا کوئی ایسی بھی صورت ہے؟

کرامت بخاری

یہ مرے خواب

یہ مرے خواب خریدے ہوئے خودساختہ خواب
ان سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
یہی شیون کی صدا
جب سرِ شام سکوں زار سے ٹکراتی ہے
تو یہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
یہ مرے خواب!
یہ روندی ہوئی راہیں میری
جن پہ ناکام تمناؤں کا بےتاب ہجوم
لحظہ لحظہ کسی جانب نگراں رہتا ہے
کون جانے کہ یہ کس سمت رواں رہتا ہے
یہ مرے خواب
خریدے ہوئے خودساختہ خواب
جن سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
ان کی تعبیر بہت دور نظر آتی ہے

تبصرہ کتب

نقد و نظر

کتاب: برسبیلِ سخن (نظمیں)

مصنف: جعفر بلوچ

مبصر: سید منصور عاقل

ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

قیمت: ایک سو پچاس روپے

''معاصر شعری منظر نامے میں اگر کوئی شاعر اسلام اور مسلمانوں کے درد سے سرشار ہو، پاکستان سے محبت کا دعوئ دار ہو، ملکی سیاسیات پر ہنر مندی سے اظہار رائے پر قادر ہو، عام معاشرہ کی صورت حال اور عمومی انسانی مسائل کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع تصور کرتا ہو اور اپنے فکری مسلک و مشرب کے اعلان و اظہار کے سلسلے میں کسی نوع کی مصلحت پسندی کو روا نہ جانتا ہو، نیز اگر اسکی شاعری میں روانی و انداز بیان میں جوانی پائی جائے اور وہ شاعری کے فنی تقاضوں سے بھی آگاہ نظر آئے تو بلا تامل سمجھ لیجئے کہ وہ ہمارے خوش گفتار شاعر جعفر بلوچ ہیں''

صاحب تصنیف کے بارے میں متذکرہ رائے کی اصابت اور صحت و صداقت پر اولاً ہمیں کوئی ابہام یا تشکیک اس لئے نہیں کہ صاحب الرائے کے مذاق شعر و ادب اور متوازن الفکر انتقادی صلاحیتوں سے راقم الحروف کا تعارف اس وقت سے ہے جب وہ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں منجملہ دیگر مضامین، فارسی زبان و ادب کے طالب علم تھے اور ہمارے ایک رفیق کار پروفیسر جابر علی جابر کے منظور نظر شاگرد رشید، پروفیسر جابر کی ایک خوبصورت غزل کا مطلع آج تک حافظہ کی امانت بنا ہوا ہے۔

جب تک لبوں کو چھوتا رہے گا کسی کا نام — جلتی رہے گی صبح سلگتی رہے گی شام

ثانیاً زیر نظر تصنیف کے تنقیدی مطالعہ کے بعد کسی بھی قاری کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ پروفیسر ڈاکٹر اسلم

انصاری کی متذکرہ رائے سے اختلاف کر سکے جن کی تجزیاتی تحریر دیگر مبصرانِ گرامی یعنی مشفق خواجہ (مرحوم) عبدالعزیز خالد اور شہزاد احمد کے نقد و تبصرہ کے ساتھ شریکِ اشاعت ہے۔

پروفیسر جعفر بلوچ شعر و ادب کی دنیا میں کوئی تو متعارف نام نہیں ان کی کم و بیش ڈیڑھ درجن تصانیف گزشتہ تین دہائیوں سے بھی متجاوز مدت میں منصۂ شہود پر جلوہ بار ہو چکی ہیں اور اربابِ علم و دانش سے سندِ اعتبار بھی حاصل کر چکی ہیں۔ان میں تین مجموعہ ہائے شعری کے علاوہ ادبی تحقیق۔انتقاد و تبصرہ اور حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ ،راجہ محمد عبداللہ نیازؒ ،مولانا ظفر علی خانؒ، اسد ملتانیؒ اور محقق و دانشور مرحوم خلیل الرحمٰن داؤدی کے فکر و فن اور شخصیات پر تصنیف و تالیف کے جواہر پارے پروفیسر جعفر بلوچ کی علمی و ادبی کاوشوں کے غماز ہیں زیرِ تبصرہ مجموعہ میں شامل منظومات کو شاعر نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے چنانچہ حصہ اول کو ''تجلیات'' کا عنوان دیا گیا ہے جو حمد و نعت اور سلام و منقبت پر مشتمل ہے اور مظہر ہے نہ صرف شاعر کے ایقان و ایمان اور جذبہ تحریم و تکریم کا بلکہ اس بلاغتِ فکر اور زبان و کلام کے ان محاسن کا بھی جو 'تجلیات' کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، ملاحظہ ہو:

(حمد) ہمیں سلیقہء اصلاحِ حال دے یارب — شدید پیاس ہے آبِ زلال دے یارب
ہمیں وقوفِ شر و خیر مرحمت فرما — ہمیں شعورِ حلال و حرام دے یارب

(نعت) نعت کا قصد ہے اگر اور خیالِ آبرو — تو بھی کرائے مرے قلم زمزمِ اشک سے وضو

جانِ 'کن فکاں' تو ہے اے مرے عظیم آقاؐ
کس جگہ نہیں تیری رحمتِ عمیم آقاؐ
دل ہم اہلِ ایماں کے ہیں ترے حریم آقاؐ
اے مرے کریم آقاؐ

(منقبت) بہرہ ور صدیقؓ ہیں اللہ کی توفیق سے — وہ مشرف ہیں شبِ معراجؐ کی تصدیق سے

شکوہِ دینِ نبیؐ سیّدی عمر فاروقؓ — مُرادِ مصطفوی سیّدی عمر فاروقؓ
حبیبِ مرتضوی سیّدی عمر فاروقؓ — دلیلِ راہبری سیّدی عمر فاروقؓ

رشکِ مہر و ماہ ہے داماں عثمان غنیؓ نطق و انشا سے ورا ہے شان عثمان غنیؓ

پیغامِ برگ و بار درِ شہرِ علمؓ ہے سرمایۂ بہار درِ شہر علمؓ ہے

انساں کی عظمت کا علم ہے تیری یادِ حسینؓ زندہ باد حسینؓ
تا بہ ابد ہر انساں دے گا تجھکو داد حسینؓ زندہ باد حسینؓ

تو دینِ حق کا نقشِ فروزاں ہے یا حسینؓ تو مظہر جلالتِ ایماں ہے یا حسینؓ
صدیقؓ اور عمرؓ ہوں کہ عثمانؓ و مرتضیٰؓ تو ان تجلیوں کا نگہباں ہے یا حسینؓ

منظومات کا گوشہ جو "حدیث چمن" کے زیرِ عنوان ترتیب دیا گیا ہے مسحورکُن اسلوب، جمالِ معنویت تیز وطن سے والہانہ محبت اور زعمائے وطن کی عقیدت و ارادت سے سرشار کلام کا آئینہ دار ہے حکمتِ شعر جہاں شاعر کا وصف کمال ہے وہیں ملی و قومی مسائل و مصائب کے حوالے سے شاعر کی تشویش اور دردمندی قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی ذہنی نشو و نما اور ادراک و شعور کی پختگی ان کی تخلیقات کا بیش بہا اثاثہ ہیں وہ احترامِ روایت اور پُر مغز و پُر معنی جدتِ فکر و اسلوب سے نہایت انہماک و کاوش کے ساتھ شعر کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دیکھئے:

(اہل وطن سے) بنائیں زمزمہ زارِ نشاط روحوں کو دیارِ جاں میں سفیرِ غزل روانہ کریں
بہار سے متمتع ہم اہل گلشن ہوں مگر اہانتِ سرمستیء صبا نہ کریں

(اے قلم) اے قلم تو ہے جہانِ علم و فن میں محترم آسمانوں نے تری عظمت کی کھائی ہے قسم

(ستارۂ صبح) شب ہوئی تو جہاد فرض ہوا چاند پر اور ہر ستارے پر
رات کو دی شکست فاش اس نے آفریں صبح کے ستارے پر

اس گوشے میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جنہیں فکر و فن کے اعتبار سے شاہکار کہا جا سکتا ہے چنانچہ "ہم اہل حرم" اور "اب جاگو بھی" ایسی ہی نظمیں ہیں جو شاعر کی دردمندی اور ذہنی کرب کی

آئینہ دار ہیں ان کے علاوہ اقبال، قائد اعظم ،ظفر علی خان اور حفیظ (جالندھری) پر کہی ہوئی نظمیں شاعر کی ارادت مندانہ طبع اور حسین شعری دروبست کی غماز ہیں۔ '' آئینہ خانہ'' ہر چند بالعموم طنز ومزاح کا شگفتہ مگر شائستہ اسلوب لئے ہوئے ہے لیکن یہاں بھی معنی کی تہوں میں اگر اُترا جائے اور بین السطور جذبہ و احساس کے درد آمیز پہلو محسوس کئے جائیں تو وہی کرب ابھر کر سامنے آجاتا ہے جو شاعر کی سنجیدہ شاعری کی روح ہے۔ ایک جگہ نظم (اقبال کا استغاثہ) میں شاعر مشرق کا حوالہ دیتے ہیں جو شاعر '' برسبیل سخن'' پر بھی صادق آتا ہے:

''مرا یاراں غزل خوانے شمردند   من اے میر اُمَم داد از تو خواہم''

جعفر بلوچ اس دیانتدارانہ اختلاف رائے کا بھی برملا اظہار کرتے ہیں جو انہیں نام نہاد اور بے بضاعت جدید شاعری اور اس کے کم سواد تخلیق کاروں سے ہے:

کلام تیرا جدید شاعر

سنا ہے میں نے پڑھا ہے میں نے
عجیب لفظوں کا رکھ رکھاؤ
عجیب تراکیب کا چناؤ
عجیب تر ان میں استعارے
فلک کے روڑے' زمیں کے تارے
بیان مفہوم کو پکارے   (نظم ابہام)

بہرکیف ہم جہاں پروفیسر جعفر بلوچ کے نقطہ نظر کی واقعیت کو معتبر سمجھتے ہیں اور انہیں زیر نظر تصنیف پر تہنیت پیش کرتے ہیں۔ وہیں انہیں از رہ اخلاص یہ مشورہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو مستقبل میں وہ طنز و مزاح پر مبنی اپنی شگفتہ تحریروں کو انفرادی حیثیت میں طبع کرائیں تا کہ ناقدین ان کے سنجیدہ کلام کی ذہنی کیفیات سے مبرا ایک علیحدہ صنف سخن کے طور پر ان کے فکر و فن کا جائزہ لے سکیں۔

کتاب : پطرس بخاری۔ شخصیت اور فن

مصنف : عبدالحمید اعظمی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

قیمت : ۱۴۵ روپے

پطرس بخاری مرحوم ہمہ جہت شخصیت تھے، انگریزی اور اردو زبان و ادب میں ان کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے مگر جس طرح غالب کو فکروفن کی کثیر الجہتی کے باوجود اپنے مختصر اردو کلام کے سبب شہرتِ دوام حاصل ہوئی بالکل اسی طرح پطرس کی شہرت اُن کے مختصر مجموعہ ء مضامین کے مرہون منت ہے گویا ''دیوانِ غالب'' اور ''مضامین پطرس'' اپنے اپنے سیاق و سباق میں یکساں انداز کی نتیجہ آفریں تصانیف ہیں۔ شخصیت جس قدر بلند و بالا ہوگی اُس کے مبصرین و ناقدین کے لئے بھی ضروری ہوگا کہ وہ فکر و نظر کے اعلیٰ اوصاف کے مالک ہوں ورنہ نقد و تجزیہ کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ عبدالحمید اعظمی کی زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے ایک شارح، مبصر اور مورخ کا کردار پوری علمی بصیرت اور محققانہ ذکاوت و ذہانت سے ادا کیا ہے وہ خود ایک صاحبِ طرز انشا پرداز اور بسیط الفہم اہل علم ہیں۔ شخصیت

ڈاکٹر الیاس عشقی

''قائد قرشی بہ از بخاری''

علامہ اقبال کی نظم ''ایک فلسفہ زادے کے نام'' برگساں کے فلسفہ 'خنداں' پر پطرس بخاری کے ایک مضمون سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ اس نظم کے دو حصے ہیں ایک برگساں کے فلسفہ سے متعلق ہے جسے عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ لیکن دوسرا جو زیادہ اہم ہے اسے اب تک بہت کم سمجھا گیا ہے۔ یہ حصہ دراصل ایک حدیث سے متعلق ہے جس میں رسول ﷺ نے بیان فرمایا ہے'' الائمہ من القریش'' (امام قریش میں سے ہوں گے) اس نظم کو ان دو اشعار پر ختم کیا گیا ہے۔

دل در سخن محمدی بند — اے پورِ علی ز بوعلی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری — قائد قرشی بہ از بخاری

آخری شعر پر بخاری نے مولانا سالک سے کہا کہ اقبال نے کمال کر دیا آخری شعر میں میرا نام بھی لے آئے ہیں۔ مولانا سالک نے ہلکا پھلکا جواب دے کر بات وہیں ختم کر دی۔ بخاری کو ایسا خیال آنا کوئی معمولی بات نہ تھی اور بات معمولی بھی نہ تھی آخری مصرعہ کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیے ''قائد قرشی بہ از بخاری''۔ اس میں مذکورہ بالا حدیث کا

اورفن کے حوالوں سے جس جانکاہی اور ژرف نگاہی سے انہوں نے اختصار مگر جامعیت سے پطرس کی جمیع الصفات زندگی کا احاطہ کیا ہے وہ ان پر اب تک کئے جانے والے تحقیقی کاموں میں سب سے زیادہ منفرد اور وقیع ہے۔

اعظمی کی یہ علمی کاوش کئی برسوں کی تحقیق وجستجو پر محیط ہے۔ ان کے ماخذِ تحقیق میں مرحوم صوفی غلام مصطفٰے تبسم کی تحریروں اور ملاقاتوں کے علاوہ کوئی تین درجن اردو کتب، رسائل و جرائد اور تقریباً ڈیڑھ درجن انگریزی زبان کی کتب، اخبارات اور عالمی سطح کے مستند آرکائیوز شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فاضل مصنف نے تقریباً دو درجن معروف و مستند شخصیات سے انٹرویو لئے، جن میں ریڈیو کی اہم شخصیات قاضی احمد سعید، سید انصار ناصری، حمید نسیم، احمد حسن شیخ، سید ظفر حسین، عشرت رحمانی، کے جی علی، ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو اقبال سنگھ، مسعود تابش اور ایس۔ اے عزیز کے علاوہ مولوی محمد سعید، آغا بابر، صادق نسیم، ڈاکٹر محمد اجمل، حمید علوی، آغا بشیر آغا عبدالحمید، اعجاز بٹالوی، سحاب قزلباش اور مرزا ادیب جیسی ہستیاں شامل ہیں جن سے پطرس مرحوم کے بارے میں وہ

ترجمہ کیا گیا ہے۔ قائد قرشی میں قائد ترجمہ ہے ائمہ کا یعنی قرشی امام ہے دراصل یہ تلمیح ہے حدیث رسول ﷺ کی طرف۔ اب اس مصرع کو دیکھیے قائد (امام) قرشی بہ از قائد (امام) بخاری۔ یعنی امام قرشی امام بخاری سے بہتر ہے چونکہ بخاری کے ساتھ امام کا لفظ لازمی طور پر آتا ہے اس لئے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ قرشی امام بہتر ہے امام بخاری سے۔ یہاں بخاری سے پطرس بخاری مراد ہو ہی نہیں سکتے۔ بلکہ امام بخاری ہی مراد ہیں۔ علامہ نے جب ضرب کلیم میں یہ نظم شامل کی تو پاورقی میں لکھا، فارسی اشعار حکیم خاقانی کی 'تحفتہ العراقین' سے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے یہ اشعار اقبال کے نہیں ہیں۔

تعجب ہے کہ خاقانی کے جو اشعار علامہ نے نظم میں شامل کئے ہیں اور دواوین میں لکھے ہیں ان پر حدیث کے ترجمہ کی حیثیت سے ابھی تک غور نہیں کیا گیا ہے۔ علامہ کے مخاطب پطرس بخاری ہیں جنھیں وہ اسطرح مخاطب کرتے ہیں کہ تو سید ہاشمی کی اولاد ہے اسلئے قرشی ہے یہ نسبت تیرے لئے قابل فخر ہے مگر تو اس کی کم تر نسبت بخاری پر قائم ہے تجھے قرشی ہونے پر فخر ہونا چاہیے کہ قرشی کو تو حدیث میں امام کہا گیا ہے۔ علامہ نے صرف یہیں تک یہی نہیں لکھا بلکہ آخری دو اشعار میں جو حکیم خاقانی کے ہیں یہ بھی کہا ہے کہ دل در سخن محمدی بند کہ تجھے تو حدیث رسول ﷺ کو اپنے دل میں جگہ دینی چاہیے اور کہا اے پور علی ز بو علی چند۔ تو تو علی کی اولاد ہے تو بو علی سینا کے پیچھے کہاں بھاگ رہا ہے تیرا فلسفیوں کے پیچھے بھاگنا اچھا نہیں ہے تجھے تو اپنی حقیقی نسبت پر فخر ہونا چاہیے۔ تعجب ہے اسکی یہ تشریح کہیں نظر سے نہیں گزری۔ یقین ہے ضرب کلیم کے شرح نگار سلیم چشتی نے ضرور اس کی تشریح کی ہوگی۔

معلومات میسر آئیں جن کے لئے متبادل ذرائع ممکن نہیں۔

کتاب کے مختصر پیش لفظ کا آغاز جسے خود عبدالحمید اعظمی نے تحریر کیا ہے' ایک ایسے خوبصورت اور ''گنجینہء معانی'' قسم کے جملے سے کیا گیا ہے جو مصنف کی سوانح نگاری کا شاہکار ہے۔ ملاحظہ ہو:

''انسان کی شخصیت ایک قفل ابجد کی طرح ہوتی ہے جس کے کلیدی اعداد اس کے اب وجد کی رگ و پے میں پیوست ہوتے ہیں۔''

اعظمی اپنا مدعائے نگارش بھی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں نے سوانح کے بیان میں کوشش کر کے ان کی تحریروں اور خطوط ہی کو بنیاد بنایا ہے تا کہ سطر سطر میں پروفیسر بخاری کا عکس جھلکتا رہے اور اپنے اس قول پر پورا اترتے نظر آئیں کہ ''وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریروں سے ہزار ہا لوگوں کو خوش کر دیتا ہے۔''

پطرس کے سوانح نگار کی حیثیت سے عبدالحمید اعظمی معتبر بھی ہیں اور موقر بھی کہ وہ ریڈیو کی طویل ملازمت کے بعد ایک اعلیٰ منصب سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے کتاب کو جن عنوانات میں تقسیم کیا ہے ان سے پروفیسر بخاری کی متنوع اور مدوجزر سے لبریز زندگی کے تمام اہم نقوش واضح ہو جاتے ہیں مثلاً ان کی زندگی میں گورنمنٹ کالج لاہور۔ ریڈیو اور اقوام متحدہ سے وابستگی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کا طالب علمی کا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک جاری رہا جہاں بحیثیت طالب علم بھرپور زندگی گزاری اور مجلّہ ''راوی'' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے ۲۶۔۱۹۲۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ (کیمبرج) گئے۔ اعظمی نے اس عہد کے واقعات کو اپنے مخصوص طرز تحریر سے جاذب توجہ بناتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ بیاں کیا ہے' جو ۱۹۲۲ء سے گورنمنٹ کالج میں بحیثیت لیکچرار ۱۹۳۵ء تک کی ملازمت کے دوران پیش آیا جس کے بعد مرحوم کو گورنر پنجاب نے ایک انگریز استاد کی جگہ انگریزی زباں و ادب کے شعبہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک اور انگریز استاد پروفیسر ڈکنسن (Dickenon) کے ریٹائرمنٹ کے بعد گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

فاضل سوانح نگار یوں تو پروفیسر کی زندگی کی تمام اہم جہتوں کو حیطہء تحریر میں لائے ہیں لیکن حکمت و دانش سے مملو حیات پطرس کو خصوصیت سے مرکز توجہ بنایا ہے چنانچہ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ میں

پاکستان کا مندوب مقرر ہونے کے بعد سے اُسی ادارہ میں انڈر سیکرٹری انچارج پبلک انفارمیشن جیسے ممتاز وارفع منصب پر تقرری اور بیرون ملک بالخصوص مغربی دنیا میں اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا جس طرح پروفیسر پطرس نے لوہا منوایا۔ اُسے صاحب کتاب نے نہایت دلپذیر انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ ریڈیو سے وابستگی جس ڈرامائی انداز میں ہوئی اسے مرحوم ہی کے ایک نابغہء روزگار معاصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ مرکزی حکومت کے ایک انتخابی بورڈ میں پنجاب کی نمائندگی کرتے ہوئے کس طرح بورڈ کے انگریز سربراہ مسٹر فیلڈن کو اپنی ذہانت وعلمیت سے نہ صرف متاثر کیا بلکہ اس قدر مرعوب بھی کیا کہ اس نے پطرس مرحوم کی ریڈیو میں تقرری کے لئے وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے خصوصی احکام حاصل کئے۔ جہاں ۱۹۴۰ء میں مسٹر فیلڈن کی جگہ کنٹرولر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں یہ عہدہ ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

فاضل مصنف نے کتاب میں پطرس بخاری کے تقریباً دو درجن شاگردان رشید کے اسماء بھی دیئے ہیں جو علم وخبر کی دنیا کے اہم ترین نام ہیں مثلاً فیض احمد فیضؔ، ن۔م۔راشدؔ، مظہر علی خاں، کنہیا لال کپور اور حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ۔ بخاری مرحوم کی ادبی تخلیقات میں مضامین پطرس کے علاوہ پطرس کے خطوط، افسانے، ڈرامے اور ناولٹ، خطبات پطرس، تنقیدی مضامین اور اقوام متحدہ میں تقاریر کا احاطہ کیا گیا ہے اور آخر میں شجرۂ نسب بھی دیا گیا ہے کہ پطرس کے ''صحیح بخاری'' ہونے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ غرض فاضل مصنف نے صرف ۱۴۴ صفحات پر مشتمل جامعیت کی اس شاہکار تصنیف کو حیات پطرس کے حوالے سے ''جام جہاں نما'' بنا دیا ہے۔ کاش وہ اس کی طباعت واشاعت کا اہتمام خود کرتے تو کتاب کے اکثر ناقابل درگزر معائب تخلیق کے سبب خود بھی ذہنی کوفت سے بچ جاتے اور قارئین بھی۔

کتاب : می رقصم (شعری مجموعہ)

مصنف : انور شعور

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : ماورا پبلشرز۔ لاہور قیمت : دوسو پچاس روپے

''می رقصم''، حضرت عثمان مروندی المعروف بہ حضرت لعل شہباز قلندرؒ کی مشہور غزل کی کیف

پرور ردیف کو اپنے اردو شعری مجموعہ کا عنوان قرار دینا انور شعور کی مجتہدانہ فکر کی آئینہ داری بھی ہے اور کلام کے مجموعی تاثر کی ترجمانی بھی۔ایک سو بارہ غزلوں پر مشتمل یہ تازہ مجموعہ شاعر کے جذبہ واحساس اور تصور و تفکر کا ایک ایسا رقصِ جمیل پیش کرتا ہے جس میں سادگی و پُرکاری اور بیخودی و ہشیاری کی تمام کیفیات مجتمع ہیں۔یعنی شعور ہی کے اپنے الفاظ میں:

کون ومکاں کے آئینہ خانوں کے درمیان دل کا جہان بھی ہے جہانوں کے درمیان

مشفق خواجہ مرحوم کی تحریر ''کچھ انور شعور کے بارے میں'' بہت کچھ ہی نہیں بلکہ شاعر کے فکر و فن اور زندگی کے سیاق وسباق کی تفہیم کے لئے ''سب کچھ'' کا درجہ رکھتی ہے چنانچہ زیرِ نظر کلام کے مطالعہ کے بعد بمشکل ہی کوئی ناقد یا صاحب نظر قاری خواجہ صاحب کی درج ذیل رائے سے اختلاف کر سکے:

> ''شعور کی غزل کے لئے میں نے 'مختلف اور منفرد' کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں انہیں روایتی توصیف نہ سمجھا جائے اس سے مری مراد یہ ہے کہ اب تک اردو غزل کے جتنے سانچے اور جتنے اسالیب ملتے ہیں شعور کی غزل ان سب سے الگ ہے۔اس کی اپنی ایک فضا ہے۔اپنا ایک مزاج ہے یہاں تک کہ ذخیرۂ الفاظ بھی مروجہ غزل کے ذخیرۂ الفاظ سے بڑی حد تک مختلف ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعور کی غزل ہماری شعری روایات سے یکسر انحراف کی مثال ہے اپنی شعری روایات سے جتنی واقفیت شعور کو ہے اتنی کم شاعروں کو ہو گی لیکن شعور نے بنے بنائے سانچوں پر انحصار نہیں کیا اپنی شعری روایات سے استفادہ کرتے ہوئے ایک الگ راہ نکالی ہے اور ایک الگ لہجے کی تشکیل کی ہے جس سے نئی غزل کی وسعتوں اور امکانات کا اندازہ ہوتا ہے۔''

خواجہ صاحب کے اس دعوے یا مفروضہ کے ثبوت میں ملاحظہ ہو۔

شعور خود کو ذہین آدمی سمجھتے ہیں یہ سادگی ہے تو واللہ انتہا کی ہے

اس کے بعد ہماری شاعری میں شعراء کی روایتی ''تعلی'' کے تمام اسالیب پھیکے پھیکے نظر آنے لگتے ہیں یہی نہیں بلکہ روایت سے بغاوت کیے بغیر روایت کو سادہ مگر پُرکشش بنانے میں شعور کی تخلیقی برجستگی اور لفظ و معنی کی مکمل ہم آہنگی نے خاص کردار ادا کیا ہے ان کے یہاں فنی محاسن کا ادراک بھی واضح ہے اور

ابلاغ کا حسن بھی ملاحظہ ہو:

اُس بے وفا سے داد وفا مل گئی ہمیں — ہم نے بُرائی کی تھی سزا مل گئی ہمیں
گیسوئے شب کھلے تو ہمیں نیند آ گئی — سو کر اٹھے تو بادِ صبا مل گئی ہمیں
اڑنے لگا دماغ ہواؤں میں دفعتاً — خوشبو جو اس پری کی ذرا مل گئی ہمیں

زمین و آسماں ہوتے ہوئے بھی — میں بے گھر ہوں مکاں ہوتے ہوئے بھی
محبت کی کہانی دلنشیں ہے — دکھوں کی داستاں ہوتے ہوئے بھی
ہزاروں خوبیاں ہیں آدمی میں • ہزاروں خامیاں ہوتے ہوئے بھی

اہل علم و دانش نے اچھے شعر کی تعریف میں مختلف نقطہ ہائے نظر بیان کئے ہیں لیکن زیر نظر مجموعۂ شعری کے مطالعہ کے بعد الطاف حسین حالی کی رائے حافظہ میں گردش کرنے لگی جو کچھ اس طرح ہے کہ ''شعر سن کر یا پڑھ کر آدمی محسوس کرے کہ یہ بات تو وہ بھی کہہ سکتا ہے مگر جب کہنا چاہے تو نہ کہہ سکے۔'' یہ طلسم انور شعور کی شاعری کا جزو اعظم دکھائی دیتا ہے' ان کی فکر کی ندرت آفرینی جب سہل و سادہ لفظوں میں ڈھلتی ہے تو فلسفہ ہو یا نظریہ۔ تلمیح ہو یا تشبیب ابہام ہو یا ایہام شعر میں دل کو چھو لینے کی کیفیت و لذت پیدا کر دیتی ہے۔ چند اشعار

حرم کو دیر خدا کو صنم سمجھتے رہے — مگر غلط بھی نہیں تھا جو ہم سمجھتے رہے

ہے دماغ آسمان پر میرا — گو مری دسترس میں خاک نہیں

ہوس بلا کی محبت ہمیں بلا کی ہے — کبھی بتوں کی خوشامد کبھی خدا کی ہے

بے سیاق و سباق ہوتا ہے — عشق اک اتفاق ہوتا ہے

اُترتی ہی نہیں گندم کی مستی — یہ دانہ دام ہو کر رہ گیا ہے

لمحہ لمحہ ہے انقلاب انگیز — اور آثار انقلاب نہیں

تعاقب خمستاں خمستاں مرا — غم و رنج و آلام کرتے رہے
مرے ساتھ ساتھ آپ کا انتظار — ستون و در و بام کرتے رہے

رہتی ہے کشاکش سی دونوں میں — ذہن پُرکار اور دل سادہ
بولنا چاہتے ہیں سچ لیکن — ہم نہیں خودکشی پہ آمادہ

سادگی، سلاست، روانی اور برجستگی شعور کے کلام میں ایک شفاف و لطیف بہتی ندی کا روپ دھار لیتے ہیں جو ہر مد و جزر سے بے نیاز پُرسکون بھی ہے اور روح پرور بھی ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ ہر تفصیل کو نہایت خوبصورتی سے اجمال میں ڈھال دیتے ہیں جو یقیناً ایک مشکل کام ہے جس کے لئے وہ انتخاب بھی ایسی بحروں کا کرتے ہیں جو بالعموم مختصر ہوتی ہیں اس میدان میں اُن کی کامیابی اظہر من الشمس ہے عصری موضوعات کا شعور ان کی شاعری میں نمایاں ہے جبکہ داخلی واردات کے اظہار کے لئے اُن کا اسلوب شگفتہ انداز میں احترامِ روایت سے مملو نظر آتا ہے، ثبوت کے طور پر:

یہ جانتے ہوئے بھی گذاری ہے زندگی — ہم زندگی کے ہیں نہ ہماری ہے زندگی
دریافت ہو رہے ہیں ستارے نئے نئے — شاید یہی ستارہ شماری ہے زندگی
بہتی ہوئی ندی پہ کسے اختیار ہے — میری ہے زندگی نہ تمہاری ہے زندگی

پچھتاؤ نہیں لغزش پا ہوگئی ہوگی — انسان سے ہوتی ہے خطا ہوگئی ہوگی
میں رات گئے نیند میں نکلا تھا اکیلا — ہمراہ مرے بادِ صبا ہوگئی ہو گی

یہ خاک یہ افلاک مرا گھر ہے یہی کچھ — تکیہ ہے اسی پر کہ میسر ہے یہی کچھ
رہ رہ کے زمیں دیکھتے رہتے ہیں فلک سے — افتادِ مزاج مہ و اختر ہے یہی کچھ
پیمانہ تو بھرتا ہے طبیعت نہیں بھرتی — انسان کا دنیا میں مقدر ہے یہی کچھ

''می رقصم'' کا شاعر محتاج تعارف نہیں تاہم کلام کے بین السطور اُس کے فکر و نظر کا سراپا واضح طور پر دکھائی دیتا ہے' اُس کی شخصیت جو خارجیت و داخلیت کا متوازن امتزاج ہے لفظ و معنی کی تہوں سے کریدی جاسکتی ہے۔ ذات و صفات کا اندازہ کرنا ہو تو لب و لہجہ ہی نہیں بلکہ جذبہ و احساس کا ہر زاویہ شعور کی شاعری میں منعکس دکھائی دیتا ہے' چنانچہ یہی انفرادیت ہے زیرِ نظر مجموعہ کی بھی اور پیش نظر مصنف کی بھی۔

شاہانہ بھی کٹتی ہے فقیرانہ بھی لیکن — ناچیز کو زیبا نہ فقیری ہے نہ شاہی

وفا ہو پیار ہو ' ایثار ہو' مروت ہو　　　انہیں صفات سے تشکیل ذات ہوتی ہے

زندہ رہتے ہیں خود آگاہ دل آزاروں میں　　　مسکراتے ہوئے پھولوں کی طرح خاروں میں

میں صرف دل کی حفاظت پہ زور دیتا ہوں　　　کہ دل نہ ہو تو سراسر فضول ہے دنیا

کتاب : نیل کے ساحل سے لے کر (سوڈان کا سفر نامہ)

مصنف : ثریا اسماء

مبصر : محمود اختر سعید

ناشر : ادارہ بتول فیروز پور روڈ۔ لاہور

ضخامت : ۷۶ اصفحات　　قیمت: ۱۲۵ روپے

کوئی زمانہ تھا جب بیرونِ ملک سفر آسان نہ تھا۔ اُس زمانے میں بھی اگر چہ دیارِ غیر کے سفر کیے گئے' مگر اُن مسافروں کی کل تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمانے نے اس برق رفتاری سے ترقی کی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ہوائی جہازوں سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ سرکاری اور نجی وفود اِدھر سے اُدھر جانے لگے۔ دنیا طول وعرض میں سمٹ کر رہ گئی۔ لوگوں کو ملک سے باہر جانے اور مختلف ممالک کی تہذیب وثقافت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں قسم قسم کے سفرناموں کے مطالعہ سے بھی' تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ممالک کے حالات کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب محترمہ ثریا اسماء کا تحریر کردہ وہ سفر نامہ ہے جو' سوڈان جیسے ترقی پذیر ملک کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ بقول رفیع الدین ہاشمی

"۔۔۔جزئیات کی تفصیل میں انہوں نے سوڈان کی مختصر تاریخ' سیاسی وسماجی حالات' عادات و اطوار' رسوم ، رواج ، لباس ، رہن سہن خور دونوش اور طور طریقوں کا ذکر کیا ہے۔"

چونکہ محترمہ کا سوڈان میں قیام فقط چند ماہ کے لئے تھا۔ اس لیے انہیں ایک پردہ دار خاتون ہونے کی بنا پر سوڈان کو اچھی طرح ہر زاویہ سے دیکھنے کے مواقع نہیں ملے۔ پھر بھی اس اجنبی ماحول کو جتنا دیکھ پائیں وہ حالات و واقعات بھی خالی از دلچسپی نہیں ایک جگہ دمازین ڈیم کی سیر کو جاتے ہوئے ایک

ایسے قبیلہ کا ذکر کیا ہے۔

> ''جو اپنے رسم و رواج کی وجہ سے شاید دنیا کا واحد قبیلہ ہو گا، جن کا کوئی مذہب نہیں۔ان کے ہاں لڑکیوں کی بجائے لڑکے اپنے آپ کو سجا بنا کر رکھتے ہیں اور شادی کے لئے لڑکیاں اپنے لئے لڑکوں کا انتخاب کرتی ہیں وہاں بہت سے لڑکے نظر آئے، جنہوں نے گلے میں موتیوں کے ہار اور گلو بند اور ہاتھوں میں زیور پہنا ہوا تھا۔اور لباس پر بھی کڑھائی سے زیبائش کی ہوئی تھی۔اور لڑکیوں نے پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں اور جانور چرا رہی تھیں۔''

علاوہ ازیں سوڈان نے تعلیم زراعت اور صنعت و حرفت کے میدان میں جہاں جہاں ترقی کی ہے اس کی نشاندھی کی ہے وہاں کے ماحول کی سادگی اور انسانی جذبوں کی قدر و قیمت کو کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔سوڈان کی آبادی میں مردوں کے مقابلہ میں خواتین کا تناسب زیادہ ہونے کی وجہ سے ہر شعبہء زندگی میں وہ مردوں کے دوش بدوش ملکی خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔

چونکہ محترمہ کا یہ سفرنامہ ایک ایسے ملک کے بارے میں ہے جس کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے اس لحاظ سے اسے ذوق و شوق اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

کتاب : انتظار سحر

مصنف : سید خالد سجاد

مبصر : محمود اختر سعید

ناشر : ماورا پبلشرز۔لاہور

ضخامت : ۱۸۴ صفحات قیمت: ۲۵۰ روپے

شعر و سخن اور افسانہ و ناول، دنیائے ادب کی وہ دو معروف اصناف ہیں جن میں ثقیل سے ثقیل اور نازک سے نازک جذبات کو مؤثر انداز میں سمویا جا سکتا ہے۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غزل اور افسانہ صرف رومانوی اظہار کے دو پیمانے ہیں، ان کے علاوہ یہ پیمانے کسی دوسری صہبائے تند و تیز کے متحمل نہیں ہو سکتے۔مگر جس طرح غزل نے قدیم سے جدید رنگ اختیار کرتے ہوئے ارتقائی اور

ارتقائی مراحل طے کیے ہیں چنانچہ ایک عام کہانی سے موجودہ دور کے افسانے تک اس صنف ادب نے بھی کئی کروٹیں بدلیں، تب جا کر صنف افسانہ کی موجودہ ہیت نکھر کر سامنے آئی ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر ایک الگ اکائی ہے، اسی طرح ہر افسانہ بھی کتاب زیست کی ایک اکائی ہے۔ جو صرف ایک واقعہ کی ایک موثر جھلک ہے وحدت فکر اور وحدت زماں اس کے بنیادی تقاضے ہیں اور فرد و سماج اور فطرت اس کی تعمیر کے اہم کردار ہیں۔ ان بنیادی تقاضوں سے ہٹ کر افسانہ لکھا جائے تو وہ کسی لحاظ سے بھی موثر نہیں ہوگا تحریر بے جان اور بے روح ہو کر رہ جائے گی۔

زیر نظر کتاب سید خالد سجاد کے نو عدد افسانوں پر مشتمل غالباً اولین کاوش ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے کئی افسانوں کے مرکزی خیال و کردار کسی غیر مرئی ماحول سے نہیں لئے بلکہ یہ سارے کردار ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے سماج سے چنے ہیں ان کے افسانوں میں عذاب، غم جاناں، تین لاشیں ہار جیت اور مذاق بڑے اچھے افسانے ہیں۔ بلکہ سبھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ افسانہ، عذاب کی آخری لائن۔۔ ''خیانت کی سزا آخرت میں تو ملے گی ہی مگر دنیا میں بھی ملتے دیر نہیں لگتی''۔ انسان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اسی طرح دیگر افسانوں میں یہاں وہاں ایسی لائنیں نظر سے گزرتی ہیں

''اگرچہ سب اس کے اپنے ہم مذہب تھے مگر تھے پھر بھی سب غیر کسی کی آنکھوں میں پیار نہیں چھلکتا۔ کسی کی باتوں سے انسانیت نہیں ٹپکتی۔ وہ کس قدر امیدیں لے کر آزاد کشمیر آئی تھی، مگر نہیں''، ''مگر نہیں''　　　　تین لاشیں۔۔

''اس دنیا میں کمزور انسانوں کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔'' تین لاشیں ان الفاظ نے اس خاندان کی عظمت اور وقار کو خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ ''یہ شادی کبھی نہیں ہوسکتی، کبھی نہیں ہوسکتی۔

کیونکہ گل، سہیل کی بہن ہے۔۔''۔ ہار جیت

ان سب افسانوں میں مذاق بہت ہی پرتاثیر افسانہ ہے جو قاری کو افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی تادیر اپنی گرفت میں رکھتا ہے آپ کے افسانوں میں کہیں کہیں یہ تاثر ملتا ہے جیسے کوئی ڈھلوان پر سے تیزی سے نیچے اترتا ہے۔ امید ہے تجربہ و مشاہدہ کی گہرائی نقش اول سے نقش ثانی میں زیادہ موثر ثابت ہو گی۔ اردو ادب کے قاری کو آپ کے قلم کی تاثیر پر پورا بھروسہ ہے۔

کتاب : ارشادات وافادات (مکتوبات معاصرین) جلد دوم

مولف : ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

مبصّر : محمود اختر

ناشر : اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

ضخامت : ۵۳۱ صفحات قیمت ۳۰۰ روپے

آجکل فون اور موبائل فون کا دور دورہ ہے خطوط نویسی کی وہ اہمیت نہ رہی، جو کبھی تھی۔ دنیا کی ہر زبان وادب میں خطوط کو صنف کا درجہ حاصل رہا ہے ڈیوی ڈیسمیل کلاسی فیکیشن میں مضامین کی درجہ بندی کرتے وقت مجموعہ خطوط کو اپنا سبجیکٹ نمر دیا جاتا ہے۔ جیسے انگلش لٹریچر کا سبجیکٹ نمبر ۸۲۰ ہے۔ اس کی مزید درجہ بندی اس طرح ہے ۸۲۰ (انگلش لٹریچر)، ۸۲۴ (مضامین)، ۸۲۵ (ڈراما)، ۸۲۶ (خطوط) وغیرہ دنیا کی ہر بڑی لائبریری میں درجہ بندی کا یہی طریقہ رائج ہے۔ بعینہ اردو ادب میں بھی درجہ بندی کرتے وقت خطوط کو ایک خاص نمبر دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر زبان وادب کی ارتقائی کڑیوں میں خطوط کی اہمیت مسلم ہے ان خطوط سے ہمیں ہم عصر ادیبوں، صحافیوں اور دنیائے سیاست سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے باہم رویوں کا پتہ چلتا ہے بقول شبیر احمد انصاری ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی عہد حاضر کے ایک ایسے بزرگ دانشور اور معتبر و ممتاز ادیب ہیں، جنھوں نے اپنی ادبی اور تخلیقی نگارشات کی مشقت کے ساتھ ساتھ اپنے معاصرین سے قلمی رابطہ رکھنے میں انتہائی جاں کاہی سے کام لیا ہے۔''

ہر مکتبہ فکر اور طبقہ خیال میں آپ کے ہزاروں مداح ہیں، جو وقتاً فوقتاً خطوط کے ذریعہ آپ سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں اور رابطہ کا یہ سلسلہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے آپ نے ان بے شمار مکتوب نگاروں میں سے صرف چودہ، ہم عصر ساتھیوں کے خطوط مع مکتوب نگار کے تعارف کے جلد دوم میں یکجا کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کا سر آغاز شبیر احمد انصاری کا تحریر کردہ ہے دیباچہ ابوسعادت جلیلی اور پیش لفظ سید رفیق عزیزی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر غلام شبیر رانا نے خطوط کے بارے میں اپنی خصوصی رائے کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے۔۔۔ ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی نے ان خطوط کی اشاعت کا

اہتمام کر کے قارئین کے ذوق ادب کی آبیاری کی ہے مجھے یقین ہے اس وقیع کتاب کی اشاعت کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور نجی اور سرکاری کتب خانوں میں اس کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے گا۔۔''

یہ محض خطوط ہی نہیں بلکہ کئی لحاظ سے علم وادب کی وہ ریفرنس بک ہے، جس سے ایک محقق کو اس عہد کی بیشمار قیمتی معلومات قطرے میں دجلہ کی مانند دکھائی دینگی۔ یقیناً یہ مکتوبات کے ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

کتاب : لا زماں سے زماں تک

مولف : جسارت خیالی

مبصّر : محمود اختر سعید

پبلشرز : کلاسیک۔ لاہور

ضخامت : ۱۵۸ صفحات قیمت ۱۵۰ روپے

ڈاکٹر خیال امروہوی ادبی دنیا کی وہ مشہور ومعروف شخصیت ہیں جو تراشیدہ ہیرے کی طرح کثیر الجہت ہیں فی الحقیقت وہ بیشمار پہلودار خوبیوں کے مالک ہیں۔ میدان شعروسخن میں وہ ایک ایسے شجر سایہ دار کی مانند ہیں جس کی چھاؤں تلے بے شمار ادیبوں نے اپنی فکر ونظر کے زاویئے درست کر کے فیض پایا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کا ان کے بارے میں کہنا ہے کہ یہ جیسے دور افتادہ صحرائی مقام پر ان کا نشیمن فقیر کا وہ تکیہ ہے جہاں ادب کے پیاسے آتے اور فکر ونظر کی شاعری سے سیراب ہو کر جاتے ہیں۔۔۔''

ڈاکٹر عاصی کرنالی فرماتے ہیں کہ ''ایسی فیض رساں شخصیت کا یہ حق بنتا ہے کہ دانشوران عصر اور اہل قلم اس کی شخصیت اور علمی وادبی کارناموں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھیں مقالے جرائد کے شمارے اور کتب تصنیف ہوں تا کہ اس کی تفہیم ترسیل اور ابلاغ کی برکات پھیلیں۔۔۔''

بہر حال زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر خیال امرہوی کے مکتبہ فکر کے ایک خوشہ چیں جناب جسارت خیالی نے ڈاکٹر خیال امروہوی کی شخصیت شاعری اور علمی وادبی خدمات کو ہر زاویہ سے یوں اجاگر کیا ہے کہ ان کے کلام اور شخصیت کا ہر گوشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم

کیا گیا ہے پہلے باب میں حالات زندگی ہیں دوسرے باب میں ان کی نعتیہ شاعری مرثیہ نگاری غزل اور نظم کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں پانچ مضامین ہیں خیال کا آئیڈیل انسان، خیال اور معاشرہ، خیال کی کالم نگاری، خیال کی نثر نگاری، نمونہ کے اقتباسات' چوتھے باب میں' خیال کا نظریہ تعلیم' خیال کا نظریہ ادب' خیال کا نظریہ معیشت' خیال کا فلسفہ اجدادیت اور خیال کا فلسفہء وجودیت کے مضامین ہیں۔ پانچویں باب میں شاگردان خیال' خیال ہم عصر اہل قلم کی نظر میں' انتخاب کلام' یادگار انٹرویو اور آخر میں فہرست کتب ہے۔

یوں ان ابواب میں ڈاکٹر خیال کے فکر وفن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے ہم عصر اہل قلم کی نظر میں ان کا کیا مقام ہے' یہ جاننے کے لئے انہیں اوراق میں ان آراء کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان کے ایک ہم عصر عبداللہ نظامی نے یہ کہہ کر کہ ''ڈاکٹر خیال امروہوی قادرالکلام شاعر ہی نہیں بلکہ دورِ حاضر کے عظیم انقلابی مفکر بھی ہیں۔۔۔'' دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

کتاب : نئی منزلیں پکارتی ہیں
مصنف : محمد داؤد طاہر
مبصّر : محمود اختر سعید
پبلشرز : فیروز سنز لمیٹڈ
ضخامت : ۳۵۲ صفحات قیمت ۳۵۰ روپے

'سفرنامہ' بھی ادب کی ایک معروف صنف ہے۔ جس کا تانا بانا افسانوی اور خیالی دنیا سے الگ مبنی بر حقائق ہوتا ہے۔ البتہ اندازِ بیان میں دلچسپی اور چاشنی پیدا کرنا' صاحب قلم کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ دورانِ سفر پیش آنے والے حقائق و مشاہدات کو سپرد قلم کرتے ہوئے کیسا اثر انگیز لب ولہجہ اختیار کرتا ہے۔ پیش آمدہ حالات و واقعات کے بیان میں ایسی ندرت ہو کہ قاری کے 'ذوق سفر' کی چنگاری کو ہوا دینے کے مترادف ہو۔

زیر نظر کتاب بظاہر سفرنامہ پنجاب ہے لیکن یہ صرف سفرنامہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ پنجاب کی تہذیب وثقافت کی وہ تاریخ اور دستاویز ہے جس میں بڑی محنت اور لگن سے وہ حقائق رقم کر دیئے گئے

ہیں جو گردشِ ایام کی نذر ہو گئے تھے' گزرتے وقت نے جس پر گردِ گمنامی کی تہہ در تہہ دبیر چادر پھیلا دی تھی۔ ہمارے یہ تاریخی اور تمدنی ورثے اگر یکسر معدوم نہیں تو فراموش ضرور کر دیئے گئے تھے۔

محمد داؤد طاہر دورِ جدید کے ایک ایسے ابنِ بطوطہ ہیں جو قابل دید مقامات کی صرف منظر کشی ہی نہیں کرتے بلکہ قاری کی انگلی پکڑے' قدم بہ قدم اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ یہاں وہاں رک رک کر قاری کو متوجہ کرتے ہیں' تاریخی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ یوں ان کی یہ قلمکاری عہد رفتہ کی بازیافت کہیے۔ مصنف نے اس تمام تاریخی وتمدنی ورثے کو جن جن زاویوں سے بیان کیا ہے' محسوس ہوتا ہے کہ ان نگاہوں سے پہلے کسی نے ان کو یوں دیکھا ہی نہیں تھا۔ پنجاب کے طول وعرض میں بکھرے ہوئے دینی مدارس' اولیائے کرام کی درگاہیں' معروف آستانے' تاریخی آثار' رومانی داستانیں' محیر العقول روایات واعتقادات' تاریخی قلعے' مساجد اور گوردوارے وغیرہ۔ یہ سبھی معلومات نہایت جزئیات کے ساتھ ایسے بیان کی گئی ہیں کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اول تا آخر قائم رہتی ہے' کہیں مزار وارث شاہ کے احاطہ میں اُگے ہوئے درخت کے پتوں کا ذکر ہے' جن کے کھانے سے غبی سے غبی شخص بھی ذہین ہو جاتا ہے۔ گجرات میں خواجہ فرد فقیر نامی بزرگ کی قبر کے ساتھ اگا ہوا ایک درخت جو 'نخلِ سخن' کے نام سے مشہور ہے' جس کے پتے کھانے سے شاعرانہ ذوق صیقل ہوتا ہے' اُوچ شریف کی ایک مسجد کا ذکر جس کی بیرونی دیوار کا لمس کمر درد کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے' کھیوڑہ کی کان کے اندر ایک دیوار جس کا نمک چاٹنے سے ایک سال عمر بڑھتی ہے' ملتان کے ایک بزرگ کے مزار کی دیوار کے لمس سے گنجے افراد کے بال آ جاتے ہیں اور نسوانی حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک کنواں؛ جس کا پانی پینے سے پھوڑے پھنسی کو آرام آ جاتا ہے' کسی مزار کی مٹی کئی بیماریوں کے لئے تریاق ہے' نور پور کے' آب شفا' کا ذکر ہے' ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواح میں ایک ایسی درگاہ' جہاں ایک خاص چیز کے لمس سے بے اولاد خواتین صاحبِ اولاد ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں رزم گاہِ سکندر و پورس' چکری انٹر چینج اور قصہ شریں فرہاد' منموہن کی جائے پیدائش' کٹاس راج کے اسرارِ خفی' رانجھے کا تخت ہزارہ' غرضیکہ پنجاب کے قریہ قریہ اور کو بکو بکھرے ہوئے معروف وغیر معروف اسرار ہائے جلی وخفی' بطریق احسن بیان کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق وجستجو کے معیار کو بھی برقرار رکھا ہے اور زیادہ سے زیادہ معلومات کی تلاش میں خانہ بہ خانہ اور در بدر جا کر دستک دی ہے۔

قبل ازیں بھی آپ نے چار عدد سفرنامے (۱) شوق ہمسفر میرا۔ (۲) سفر زندگی ہے (۳) اک سفر اور سہی' (۴) منزل نہ کر قبول۔۔۔ لکھ کر اس صنفِ ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ آپ کی تحریر

میں ایک پختہ کار اہلِ قلم کی روانی اور دلچسپ پیرائیہ اظہار نمایاں ہے۔اس دستاویز کو قلم سے قرطاس تک لانے میں وسائل کے ساتھ ساتھ ذوق وشوق کی مہمیز نے بھی بہت اہم رول ادا کیا ہے۔اُمید ہے آپ کی یہ کاوش بھی آپ کے دیگر سفرناموں کی طرح پسندِ خاطرِ اہلِ ذوق ثابت ہوگی۔

نام کتاب : کپورتھلہ سے لاہور تک

مصنف : سید ناصر الدین

مبصر : محمد شفیع عارف دہلوی

ناشر : منزل پبلیکشنز۔اسلام آباد

قیمت : مبلغ۔/۲۰۰ روپے

زیرِ نظر کتاب سید ناصر الدین کی تصنیف ہے جو ۸۷ اصفحات اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔
مصنف کا تعلق کپورتھلہ کے ایک تعلیم یافتہ اور معزز خاندان سے ہے جو مشرقی پنجاب کی ایک چھوٹی سکھ، مگر خوشحال اور ترقی یافتہ ریاست ہے۔

موصوف نے کپورتھلہ کے محل وقوع ،آب وہوا، تاریخی عمارات، تعلیمی ادبی ثقافتی معاشی اور معاشرتی حالات سےلیکر وہاں کی چند ایسی اہم اور نامور شخصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے جنھوں نے کپورتھلہ کے اسکول اور کالج سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود کو مزید قبائے علم و ہنر سے آراستہ کیا اور پھر پاکستان کے بڑے اہم اور کلیدی عہدوں پر گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ان میں غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان ۔میاں محمد طفیل سابق امیر جماعت اسلامی سر سکندر حیات اور مس گلزار بانو وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے نتیجہ میں مصنف نے جب اپنے خاندان کے ہمراہ کپورتھلہ (مشرقی پنجاب) سے لاہور پاکستان ہجرت کی تو راستے میں قتل وغارتگری کے جن واقعات سے دوچار ہوئے اور مسلمان عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے ریلوے لائن کے دونوں جانب بکھرے ہوئے بے گوروکفن لاشے دیکھے ان کو ایسے المناک اور دلخراش انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھکر بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اس ہجرت کے نتیجہ میں مصنف کے خاندان کے کئی افراد بھی شہید ہوئے دراصل ان خوں

آشام فسادات کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو پاکستان بنانے کی سزا دی جائے۔ ان کی املاک پر قبضہ کیا جائے اور دوسری طرف ان بچے کھچے مسلمانوں کو تہی دست تہی داماں پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائے تاکہ اس نوزائیدہ مملکت پر اتنا معاشی دباؤ پڑے کہ وہ فیل ہو جائے ختم ہو جائے۔

بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنے کے لئے دو کمیشن مقرر کیے گئے تھے اور ریڈ کلف جو برطانیہ کا ایک بدنام زمانہ بے ایمان وکیل تھا اس کا چیئر مین تھا (جس کا فیصلہ آخری تھا) ضلع گورداس پور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور یہ پاکستان نقشہ میں شامل کیا گیا تھا لیکن اس کی تحصیل پٹھان کوٹ وہ واحد بری راستہ تھا جو ہندوستان کو کشمیر سے ملاتا تھا اس لئے ریڈ کلف نے انتہائی بد دیانتی اور بے انصافی سے کام لیتے ہوئے (اپنے ذاتی مفاد کی خاطر) پورے گورداس پور کا علاقہ بھارت کو دے دیا جس سے کشمیر کا سنگین تنازعہ پیدا ہو گیا جو آجتک حل طلب ہے اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ستلج اور راوی کے ہیڈ ورکس قدرتی طور پر بھارت کے پاس چلے گئے۔

اسی طرح امرتسر کی تحصیل اجنالہ اور فیروز پور کی تحصیل زیرہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ریڈ کلف نے یہ دونوں علاقے بھی بھارت کے حوالے کر دیئے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کے دریاؤں کا منبع یعنی دریائے ستلج، بیاس، راوی اور چناب کا پانی بھارت کے قبضہ میں چلا گیا اور مغربی پاکستان کی زمین بنجر اور بے آب و گیاہ ہو گئی۔

زیر نظر تصنیف میں یوں تو تقسیم ہند کے فسادات، مہاجرین کی پاکستان میں آمد، انکی آباد کاری وغیرہ کے مسائل کو بہت تفصیل کے ساتھ نہایت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ اہم کام جو مصنف نے سر انجام دیا ہے میرے خیال میں وہ مشرقی اور مغربی پنجاب کی تقسیم کے سلسلہ میں "ریڈ کلف" نے جو بد دیانتی اور بے انصافی سے کام لیا ہے اسکے بہت سے مخفی گوشوں کو مکمل ثبوت اور نہایت ذمہ داری کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ تقسیم ہند کا یہ پہلو لوگوں کی نگاہوں سے بڑی حد تک اوجھل تھا۔ اس کتاب نے اس خلاء کو بڑی عمدگی کے ساتھ پُر کیا ہے۔ جس سے اس تصنیف کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے میں سمجھتا ہوں اس کتاب کا مطالعہ ہر پاکستانی کو کرنا چاہئے تاکہ انگریزوں اور ہندو لیڈروں کے مکروہ چہروں سے شناسائی اور واقفیت ہو سکے۔

مراسلات

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی۔لیہ (پنجاب)

سہ ماہی الاقربا اپریل تا جون ملا۔حسب عادت اداریہ پڑھا،آپ کے رشحات فکری ہمیشہ سے ایک مخصوص تہذیب وثقافت کے امین رہے ہیں گویا عوامی تمدن سے الاقربا کی قربت ایک مضبوط ومربوط رابطے کی محافظ ہوتی ہے جن اہل قلم کی اعانت سے الاقربا مزین ومشین ہوتا ہے وہ سب وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں نظم کا شعبہ اور بھی جاندار ہوتا ہے کیونکہ شاعر (اسم فاعل) شعور عطا کرتا ہے زباں داں اور نقاد ہوتا ہے شاعر کا ہر شعر قاموس کا درجہ رکھتا ہے ہر شعر پر مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

ادب منضبط اظہاریت کے رویے کا نام ہے۔ماضی میں جتنی تصانیف بھی مطالعے میں آئی ہیں ان کا مقصد تہذیب الاخلاق' تدبیر منزل' سیاست مدینہ فاضلہ ہی ہوتا تھا،ادب نا معلوم کو معلوم میں منتقل کرتا ہے۔عقل کو جہل کی ظلمت سے نکال کر اسے مہذب بناتا ہے گویا آدمی کو جو سر کے بل کھڑا ہے اسے قدموں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ادب کے بارے میں شور وغوغا بھی ہوتا رہتا ہے کہ گزشتہ ۵۸ برس میں اس قوم کو تعلیم کا تحفہ تو دیا گیا لیکن تربیت کی طرف توجہ نہیں دی گئی تربیت وہ ملکہ ہے جو آدمی تو ایک طرف حیوان کو بھی باشعور بنا دیتا ہے۔مغرب اور مشرق کی چکی کے دو پاٹوں میں پسنے والے عوام کی کیا تقصیر جب اتالیق خود بے تربیتی کی راہ پر چلتے رہے ہیں۔جناب قاضی جاوید صاحب نے راقم کے مضمون مغربی تہذیب کے فکر انگیز تجزیہ کے حوالے سے ٹھیک ہی لکھا کہ ہم سب مشرق میں پیدا ہوئے لیکن مغرب پرست کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں مغرب کے جو سائنسی احسانات انسانی برادری پر ہیں ان سے کس کافر کو انکار ہوسکتا ہے۔ملّا نے تو کوئی کام نہیں کیا لکیر کے فقیر رہے۔

پروفیسر مشکور حسین یاد۔لاہور

تازہ شمارہ الاقربا اپریل۔جون ۲۰۰۶ء ملا اور حسب سابق اسی آن بان اور ٹھاٹ باٹ سے ملا۔یوں تو سبھی مضامین نظم ونثر اعلیٰ درجے کے ہیں لیکن 'جہاں حضور آرام فرما ہیں' اور 'بنی اسرائیل اور ریاست اسرائیل' بڑے معلومات افزا ہیں' ان معلومات سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔غزلوں میں ایک

سے ایک غزل عمدہ کرامت بخاری چھوٹی بحر میں بڑی باتیں کرنے لگے ہیں۔اور انکی نظم میں بھی ایک انفرادیت ہے عبدالعزیز خالد نے نعتِ حالی پر کیا بے ساختہ قسم کی تضمین کی ہے۔اسی طرح ہر غزل گو کوئی نہ کوئی کمال دکھا رہا ہے۔

اس دفعہ آپکا اداریہ چھیڑ چھاڑ کے لئے یا ڈانٹ ڈپٹ کے لئے بڑی وسعت رکھتا ہے لیکن دیکھ لیجے ادب اور اہل ادب کی تعریف وتحسین کرنا تو آسان ہے انہیں کوئی گائیڈ لائن دینا آسان نہیں اس میں ایک بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ سچا ادب ہمیشہ ہر طرح کی خوبیوں سے مزّین ہوتا ہے اور سچے ادب کے سوتے کبھی بند نہیں ہوتے۔مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں۔بقول غالب چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔اعلیٰ قسم کے ادیب شاعر سے ہم ایک توقع یہ بھی رکھتے ہیں کہ جیسے وہ لکھنے میں نظر آتے ہیں ویسے ہی وہ عام زندگی میں بھی ہوں یہ توقع غلط ہے مثال کے طور پر احمد فراز عموماً بیرون ملک کے مشاعروں میں اپنے علاوہ دوسرے شاعروں کا مذاق اڑانا اپنی خوبی سمجھتے ہیں یا منیر نیازی کسی دوسرے کو داد دنیا گناہ سمجھتے ہیں۔مراسلات میں ڈاکٹر انیس قدوائی کا میں بے حد شکر گزار ہوں کہ موصوف نے مجھے یاد رکھا۔نقد ونظر میں آپکے تبصرے بھی خوب ہیں۔افتخار عارف اچھے شاعر ہیں ان کی شاعری کی میں نے ہمیشہ داد دی ہے وہ بظاہر ملتے بھی بڑے زور سے ہیں مگر مجھے ہمیشہ ان کے ملنے ملانے میں تصنع ہی نظر آیا۔کبھی ان سے یہ بات مجھے ضرور پوچھنی ہے دو تازہ بہ تازہ غزلیں ملفوف کر رہا ہوں۔

مضطر اکبر آبادی۔اسلام آباد

اپریل ۲۰۰۶ء کا ''الاقربا'' ملا ماشاء اللہ صوری ومعنوی دونوں اعتبار سے بہت خوب ہے۔ آپ نے اداریہ میں جو نکتہ اٹھایا ہے۔وہ فی الواقع لائق توجہ ہے۔آج کے دور میں ہمارا ادب انحطاط کے جس مرحلہ سے گزر رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔نثری ادب کا جو حال ہے وہ تو ہے ہی لیکن شعری ادب کی صورت حال بھی خاصی تشویشناک اور مایوس کن ہے اور اس کی نمایاں وجہ ہماری علمی وفنی کم مائیگی ہے۔الفاظ کا صحیح استعمال بہت حضرات کو آتا ہے،قواعد سے عدم واقفیت کا سلسلہ عام ہے۔تذکیرو تانیث کا معاملہ بھی دگر گوں ہے،ناموزوں اذ روزن سے گرے ہوئے اشعار اکثر رسائل واخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔اول تو رسائل وجرائد ہیں بہت کم اور جو ہیں ان میں اجارہ داری کا سلسلہ قائم ہے کسی

تحریر کو شائع کرتے وقت معیار کی طرف توجہ کم دی جاتی ہے شخصیت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور ہم سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ''ناراضگی'' اور ''انکساری'' جیسے غلط لفظ استعمال کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے۔ ہما ہمی کو گہما گہمی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جبکہ ہما ہمی کا لفظ انانیت کے معنی دیتا ہے۔ مشدد حرف کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد نظم کر دیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کی طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے مگر کسی کو کیا پڑی ہے کہ یہ درد سری مول لے۔ زیر نظر ''الاقربا'' میں ''جہاں حضورؐ آرام فرما ہیں'' مضمون بے حد تحقیقی اور علمی ہے۔ اس میں صاحب مضمون نے بعض ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جن کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں سے متعلق مضمون ان کی علمی، سیاسی، صحافتی، خطیبانہ اور شاعرانہ عظمتوں کا ترجمان و آئینہ دار ہے۔ ان جیسے بدیہہ گو شاعر بہت کم ہوئے ہیں راولپنڈی سے متعلق مضمون جہاں معلومات میں اضافے کا سبب ہے وہیں راولپنڈی کی تاریخی حیثیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ ''الاقربا'' کے اداریے کے عنوان سے تحریر میں رسائل و جرائد کے جن اداریوں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں ان سے ایک جدت اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے دہلی میں پھول والوں کی سیر بہت خوبصورت خاکہ ہے جس سے دہلی کی تہذیب، معاشرت اور عوامی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے یہ خاکہ پڑھ کر مجھے اپنے شہر ''آگرہ'' کے میلے ٹھیلے، پتنگ بازی کے مقابلے۔ کبوتروں کی قلقلیں شعبان کی پندرہویں شب کے آغاز سے طلوع فجر تک آتشبازی کے سلسلے اور ہر قمری ماہ کی چودھویں شب کو تاج محل کی چار دیواری میں تماشائیوں کے ہجوم یاد آگئے۔ اور ہاں اس دفعہ ''الاقربا'' کا حصہ غزلیات خاصا جان دار ہے۔ اللہ کرے آئندہ اس سے بھی بڑھ کر شان دار ہو۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ لاہور

الاقربا کا تازہ شمارہ آپ کے فکر انگیز بلکہ درد انگیز اداریے سے شروع ہوا۔ آپ کی تعمیری سوچ میں تقابلی مطالعے اور اس کے نتیجے میں مختلف اصناف نظم و نثر میں انحطاط کے واضح اشارے موجود ہیں یہ درست ہے کہ ماضی میں قد آور قلمکاروں کا قبیلہ سرگرم تخلیق رہا اور ادب پر ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی نظر آئی۔ اُس دور کے ادبی جریدے بھی سادہ کم قیمت لیکن ادبی اور علمی اعتبار سے وقیع ہونے کے سبب

ادب سے شغف رکھنے والوں میں مقبول رہے، دوسرے ماضی کے مدیران کرام انتہائی مخلص، محنتی اور خسارہ اٹھا کر خوش رہنے والے تھے، عہد موجود میں گلیمر نے چکا چوند پیدا کر رکھی ہے۔ سادگی کی جگہ رنگینی اور رعنائی اور خودنمائی جگہ پا چکی ہے، ڈرائنگ روم میگزین بالائی طبقے کی ضرورت بن چکے ہیں، اسی طرح نام نہاد مذہبی جریدے سطحی معلومات بہم پہنچا کر اپنا حلقہ ارادت وسیع کر رہے ہیں۔ ادب پر گفتگو کرنے کے لئے وسیع مطالعہ درکار ہے کلاسیکی ادب سے لیکر عصری ادب تک کتنے لوگوں کی رسائی ہوگی یہ تمام مسائل اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھنا اور مسائل کو زیر بحث لانا ضروری ہے، آپ کی یہ بات درست ہے کہ معاصر تخلیقات میں نہ فکری اعتدال و توازن ہے نہ محبت و رواداری کا وہ پیغام جس کے ذریعے ہمارے صوفی شعرا نے معاشرہ کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

آپ کی تحریر میں قنوطیت سے رجائیت کی طرف سفر بھلا معلوم ہوا کہ یہی انداز نظر شاعر مشرق کی مقصدی شاعری میں نظر آتا ہے، اداریے کے آخری حصے میں ملک کے ممتاز دانشور اور بین الاقوامی مدبر صاحبزادہ یعقوب خاں کا حوالہ معتبر ٹھہرا کہ یہ خطبہ مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بلیغ اشارات و معانی کا ایک جہان سموئے ہوئے ہے۔ آپ کے بقول ادب میں عالمگیریت مشروط ہے' عہد موجود میں ہم جس ابتلاء سے گزر رہے ہیں یقیناً قوم کے دانشوروں کو اس کی خبر ہے لیکن اس ابتلاء میں اقوام عالم کے صحیح العقیدہ اور احترام آدمیت کا حقیقی شعور رکھنے والے افراد کا فرض ہے کہ وہ کرۂ ارض پر عالمی برادری کے درمیان برابری اور انصاف کو ممکن بلکہ یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اسی طرح دنیا کی مختلف زبانوں کے ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور قلمکاروں کی سالانہ کنونشن کا اہتمام کیا جائے جن میں عالمی ضمیر کو بیدار اور مظلوم قوموں کے حقوق بحال کرنے کو یقینی بنایا جائے، صاحبزادہ یعقوب خان کی اس بات سے اتفاق نہ کرنا کم عقلی ہوگی کہ حقیقی ادب کی بنیاد ہمیشہ انسانی وحدت پر قائم ہوتی ہے۔

فیروز الدین احمد فریدی کا مضمون ''جہاں حضور آرام فرما ہیں'' نہ صرف معلومات افزا ہے بلکہ ایمان کی تازگی میں اضافے کا سبب بھی بنا ہم چشم تصور سے وہ مرقع دیکھنے کے قابل ہوئے کہ آنحضرتؐ نے مختصر سی جگہ کی تقسیم کرتے ہوئے سب کے حقوق کو پیش نظر رکھا، ہوسکتا ہے کہ الاقربا کا کوئی قاری اختلاف نظر رکھتے ہوئے ان کی تحقیق کو حوالوں کی بنیاد پر پرکھ کر کوئی اور نقشہ سامنے لائے۔ یہ بھی سچ ہے ہم غلط فہمی اور غلط بیانی کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے لائق ہوں۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا مضمون

''تصوف اور اقبال'' کے عنوان سے شامل اشاعت کیا گیا یہ وہ موضوع ہے جس پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تصوف میں بے ثباتی حیات کے تصور کو جتنی قدر و منزلت حاصل ہے وہی ہمارے زوال کا سبب بنی، علامہ اقبال واضح نقطہ نظر رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں یہ فلسفہ بظاہر بہت دل آویز ہے لیکن افسردگی اور اضمحلال پیدا کرنے والا ہے مشرقی ادب میں اس فلسفے کو قبول عام حاصل رہا۔ اثبات حیات کا نظریہ ردعمل کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ''اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا!'' صاحب مضمون نے جتنے حوالے اور کتابیات کی فہرست پیش کی وہ لائق مبارک باد ہیں۔

افتخار اجمل بھوپال نے بنی اسرائیل اور ریاست اسرائیل کا تاریخی پس منظر نہایت محنت سے تحقیق کی میزان میں رکھ کر نذر قارئین کیا اور برطانیہ کی سفاکانہ عیاری کا پردہ چاک کیا، الاقربا میں مندرجہ بالا جتنے مضامین شائع ہوئے انہیں علم دوست حضرات یا تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے بغور پڑھیں گے لیکن شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کو صرف اوراق الٹنے کی جلدی ہوگی البتہ ڈاکٹر انور سدید کا مولانا ظفر علی خان پر مضمون اپنے اندر ایسی دلکشی رکھتا ہے جسے علمی ادبی اور تنقیدی شغف رکھنے والے پڑھیں گے مولانا ظفر علی خان نڈر صحافی، سیاست دان اور برصغیر پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کے عظیم رہنما تھے۔ ان کا پیشہ صحافت رہا، صحافت سے وابستہ افراد ہنگامی شاعری میں طاق ہوتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان فی البدیہہ شعر کہنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے، ڈاکٹر انور سدید نے ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنا مضمون مکمل کیا، وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

ہمارے دوست جمیل یوسف بھی کمال کے آدمی ہیں پہلے شاعرانہ کمالات دکھانے اور اب نثر نگاری میں قلم فرسائی ان کا محبوب مشغلہ بنا ہوا ہے اردو ہماری قومی شناخت ہے۔ ایسا عمدہ مضمون سپرد قلم کیا کہ جسے پڑھتے ہوئے یہی کہنا پڑے گا کہ یہی کچھ ہم بھی کہنا چاہتے ہیں مگر یہاں ہر برسر اقتدار حکومت انگریزی کو ذریعہ بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے عشاق اردو اب کہاں پیدا ہیں۔ میں برادرم سید مشکور حسین یاد کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے الاقربا کے قریب تر کر دیا ہے اور ہاں حصہ نظم میں آپ کا ذوق انتخاب اور شعراء کی نگارشات نے غزل اور نظم کے معروف شعراء کی ایک کہکشاں سجا رکھی ہے آپ کے تبصرے اور احباب کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہمیں قطعاً مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہم زندہ قوم ہیں۔ پائندہ قوم ہیں۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا۔ جھنگ

سہ ماہی الاقربا جون ۲۰۰۶ء موصول ہوا شکریہ۔ معاصر ادب میں فکری و نظریاتی اعتدال کی ضرورت پر اداریہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قومی دردمندی اور مثبت سوچ سے لبریز یہ تحریر فکر و نظر کو مہمیز کر رہی ہے۔ مقالات مضامین الاقربا کا اہم حصہ ہیں اس شمارے میں فیروز الدین احمد فریدی، افتخار اجمل بھوپال، ڈاکٹر سدید، جمیل یوسف اور نوید ظفر کے وقیع مضامین دوررس اثرات کے حامل ہیں۔ گوشہ الاقرباء میں سید منصور عاقل، ڈاکٹر محمد معزالدین صاحبزادہ یعقوب خان، محترمہ سعیدیہ راشد، محمود اختر سعید، انجم خلیق، اور شریف فاروق کی تحریریں اس رجحان ساز ادبی مجلے کو حقیقی تناظر میں سامنے لا رہی ہیں۔ ''الاقربا کے اداریے'' میں محمود اختر سعید نے تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔ شفیع عارف دہلوی اور سید خالد سجاد نے خاکہ نویسی کا حسن نکھار دیا ہے۔ محمود اختر سعید کی تحریر پتھروں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوا لیتی ہے ''اجرت'' ان کا شاہکار افسانہ ہے۔

حمد و نعت سلام و منقبت میں اختر علی خاں اختر چھتاروی' عبدالعزیز خالد' حمایت علی شاعر' عرش ہاشمی' ضیاالحسن، محمود رحیم اور سید حبیب اللہ بخاری کا کلام پسند آیا۔ غزلیات دھنک رنگ میں جلوہ گر ہیں، سید رفیق عزیزی، مضطر اکبر آبادی، شارق بلیاوی، مشکور حسین یاد، مشتاق شبنم، حسن عسکری کاظمی، خالد یوسف، عقیل دانش، کرامت بخاری ارشد محمود ناشاد، انور شعور، مختار اجمیری، نورالزماں، صدیق شاہد، امین راحت چغتائی، سلیم زاہد صدیقی، سہیل اختر، انوار فیروز، اویس جعفری اور ضیاء الحسن کا دلکش کلام مجلّہ کا حسن نکھار رہا ہے۔ حسن عسکری کاظمی کے یہ شعر دل میں اتر گئے۔

جو معجزہ مرے کردار کی زباں سے ہوا　　　ہوا زمین سے ممکن نہ آسمان سے ہوا

جی مضمحل ہے وقت کی افتار دیکھ کر　　　اہل قلم کو زر کا طلب گار دیکھ کر

منظومات میں عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر آنند موہن گلزار زتشی دہلوی اور خالد یوسف کا موثر کلام اپنی مثال آپ ہے۔ قطعات و رباعیات میں حمایت علی شاعر، عبدالعزیز خالد، کرامت بخاری، مشتاق شبنم اور سید انتخاب علی کمال نے معجزۂ فن کو تسلیم کرایا ہے۔ سید منصور عاقل اور محمود اختر سعید نے کتابوں پر خوب تبصرے لکھے ہیں۔ انہوں نے قطرے میں دجلے کا منظر دکھا دیا ہے۔ مراسلات میں نصف ملاقات ہو

گئی۔خبر نامہ پڑھ کر الاقربا کی سرگرمیوں سے آگاہی ہوئی۔اس مجلّے کی اشاعت سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا ہے ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔

خالد یوسف۔آکسفورڈ (برطانیہ)

الاقرباء کا اپریل جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔صوری اور معنوی حسن سے مرصع اور عمدہ اور معیاری شعری و نثری تخلیقات سے مزین ہے۔آپ کا اداریہ معاصر ادب میں فکری اور نظریاتی اعتدال کی ضرورت حسب حال اور برمحل مشورہ ہے۔

فیروز الدین احمد فریدی نے اپنی تحریر ''جہاں حضور آرام فرماہیں'' میں بڑے تکنیکی اور منفرد انداز میں روضہء رسول کی اندرونی ساخت پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا موقر مقالہ ''تصوف اور اقبال'' بڑے واضح انداز میں فلسفہ وحدت الوجود کے اسلام کی روح کے منافی ہونے کے باعث حافظ شیرازی اور ابن عربی اندلسی کے افکار کی مخالفت کے اسباب اجاگر کرتا ہے۔افتخار اجمل نے اپنے مضمون ''بنی اسرائیل اور ریاست اسرائیل'' میں بڑی خوش اسلوبی سے صیہونی ریاست کے قیام میں مغربی طاقتوں کے ظالمانہ اور منافقانہ کردار کا پردہ چاک کیا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کا مقالہ فکر و نظر کی حریت کا پاسبان ،مولانا ظفر علی خان ،ملت اسلامیہ کے اس بطل جلیل کو شایان شان خراجِ عقیدت ہے۔ میرے یار دیرینہ جمیل یوسف کا مضمون ''اردو ہماری قومی شناخت'' اردو کے دفاع میں ایک معرکتہ الآرا تحریر ہے۔شفیع عارف دہلوی کا مضمون دہلی میں پھول والوں کی سیر قدیم دہلی کی تاریخ کے شگفتہ دریچے وا کر رہا ہے۔محمود اختر سعید کا افسانہ ''اجرت'' پُر لطف بھی ہے اور سبق آموز بھی۔حمایت علی شاعر کی نعت، شہر علم اور نظم کربلا عمدہ ہیں۔عبدالعزیز خالد کی نظم ،عفت موہانی رقت انگیز ہے۔مشتاق شبنم کی نظم میں کیسے لکھوں اور سید انتخاب کمال کی نظم بیٹی بھی دلآویز ہیں۔غزلیں اکثر عمدہ ہیں اور مندرجہ ذیل اشعار خصوصیت سے لائق ستائش ہیں۔

اس عہد جبر میں یہ حوصلہ بھی کم تو نہیں　　　میں ہنس رہا ہوں دل پائمال رکھتے ہوئے

(مشتاق شبنم)

قدموں پہ مہ و مہر ہیں لیکن دانش　　　انساں ہے ابھی خاک بسر سوچو تو

(عقیل دانش)

کی اس غزال چشم نے وہ پیشکش کہ ہم　　　توبہ کے باوجود اسے ٹھکرا نہیں سکے

(انور شعور)

وقت کتنا بھی تلخ ہو جائے　　　کچھ حلاوت زبان میں رکھئے

(سلیم زاہد صدیقی)

بس ایک جان ہی باقی تھی ہم فقیروں کی　　　سو وہ بھی ہم تیری بیگانگی پہ وار آئے

(محمد اویس جعفری)

کرامت بخاری۔ لاہور

الاقرباء حسب روایت، حسب سابق انتہائی خوبصورت و قیع جامع اور موثر، جریدۂ ادب نظر آیا، یہ آپ کی محنت اور اردو ادب سے محبت کا نتیجہ ہے، جناب حمایت علی شاعر، محمود رحیم، سید حبیب اللہ بخاری، محترم مشکور یاد، حسن عسکری کاظمی اور برادرم انوار فیروز کی تخلیقات بہت پسند آئیں۔ قطعات، رباعیات، مقالات، مراسلات و دیگر منظومات، شعریات، غزلیات، اور مختلف شخصیات کے گوشہ جات سبھی کچھ فکر انگیز عمدہ، معلومات افزا اور خیال افروز ہیں، اتنا عمدہ پرچہ نکالنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ برادرم محمود رحیم کی صحت کے بارے میں فکر مند ہوں اللہ انہیں زندگی اور صحت سے رکھے۔ ڈاکٹر معز الدین صاحب، ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب اور محمود اختر سعید صاحب کو سلام عرض کیجئے گا، اسلام آباد کی محفلیں اور دوست بہت یاد آتے ہیں۔

محترم جمیل یوسف صاحب کی تحریر بہت عمدہ ہے اردو ہماری جان، پہچان، ایمان، ایقان، آن بان شان اور زبان ہے اس کی خدمت، ارتقاء، ترقی، ترویج، اشاعت اور ترسیل ہمارا قومی فریضہ ہے، یہ ہمارے بزرگوں، پرکھوں اور آباؤاجداد کی زبان ہے۔ اس کے بغیر ہم گونگے ہیں۔ آپ کا الاقرباء انتہائی باوقار جریدہ ادب ہے خدا کرے یہ چراغ یونہی روشنی دیتا رہے، ایک تحریک بنے اور ادبی دنیا کو نئے مشاہدے، نئی فکر اور نئی سوچ سے منور کرے۔ محترم مشکور یاد صاحب کی غزلیات ان کی لسانیات، نئی تراکیب اور نیا انداز بہت ہی اچھا لگا۔ ہر نئی چیز کی مخالفت ہوتی ہے مگر جب وہ آہستہ آہستہ سمجھ آنا شروع ہوتی ہے تو مانوس ہو جاتی ہے، مشکور صاحب کا تجربہ، مطالعہ، تفکر اور ابلاغ نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ انتہائی، کثیر الجہات، مرنجاں مرنج اور زندہ دل شخصیت ہیں خدا کرے وہ یونہی ادبی تخلیقات سے

نوازتے رہیں۔ ڈھیروں دعائیں سہل ممتنع اور چھوٹی بحر میں دو غزلیں حاضر ہیں۔

عرش ہاشمی۔ اسلام آباد

''الاقرباء'' کا شمارہ اپریل۔ جون موصول ہوا۔ تمام تر مصروفیات کے ساتھ ساتھ تمام نگارشات کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ اس مرتبہ افسانے کا حصہ کمزور معلوم ہوا۔ نسبتاً حصۂ نظم بھرپور رہا۔ اب ''الاقرباء'' کے تازہ شمارے کا انتظار رہنے لگا ہے۔ اور یہ سب آپ کی ریاضتوں اور عرق ریزیوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کے جریدے میں شگفتہ مضامینِ نظم ونثر کی کمی ہے۔ اس طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر آنند موہن گلزار زُتشی دہلوی (بھارت)

حضرت فدا گلاؤٹھوی شاگرد و نورتن نواب مرزا داغ دہلوی سالکِ پاکباز مولانا پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی بزمِ سخن میں تشریف لاتے تھے میں نے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۳ء کے درمیان ان کی زیارت کی ہے۔ جناب قابل گلاؤٹھوی میرے کرمفرما تھے اور ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ ان حضرات کے تعلقات بیخود صاحب' سائل صاحب' آغا شاعر صاحب' زار صاحب' کیفی صاحب' برج کشور زتشی شور' نوح ناروی' سیماب اکبرآبادی' جوش ملسیانی' احسن مارہروی' باغ سنبھلی ان سب اساتذہ سے تھے جو دلّی میں 'بزمِ سخن' میں (میرے بزرگوں کی انجمن) تشریف لاتے تھے۔ حضرت فدا گلاؤٹھوی ایک مستند اہلِ زبان' فصیح العصر استادِ ادب' داغ اور دلّی سکول کے کلاسیکی غزل کے معتبر اور برگزیدہ و ممتاز کہنہ مشق استاد شاعر تھے۔ بے شمار حضرات ان سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔

رسالہ ''شاعر'' سیماب صاحب کے پوتے اعجاز صدیقی کے بیٹے امام اب ممبئی سے نکالتے ہیں۔ سرِ دست ان کا پتہ میرے پاس نہیں ہے۔ جولائی میں ممبئی جاؤں گا تو معلوم کرلوں گا۔ وہی ۱۹۳۷ء کا شاعر اور احسن صاحب کا مضمون فراہم کر سکتے ہیں۔ دلّی کی لائبریریاں ۱۹۴۷ء سے برباد ہوئیں اور لسانی' ملکی' مذہبی نفرت اور فرقہ پرستی اور اردو والوں کی عدم توجہ سے برباد ہوتی چلی گئیں۔ فرقہ پرستی نے زبان' ادب' تہذیب کو بھی نہ چھوڑا۔

آپ کی تالیف (برگِ سبز) سعدی کے مشہور عالم شعر کے اعتبار سے صحیح ہے۔ آپ نے نہایت تاریخی خدمت انجام دے کر ایک ادبی دستاویز پیش کی ہے اللہ تعالیٰ اس سعادت مندی کی آپ کو

جزائے خیر عطا کرے اور سرخرو و کامیاب و ممتاز فرمائے۔ آپ کو داغ سکول کے علاوہ بھی حسرت، اصغر، جگر اور فراق کی ارواح بھی دعا دے رہی ہونگی۔ فدا صاحب کا حسن کلام، اچھوتا اندازِ بیان اور تغزل کی وارفتگی ان کو معاصرین میں بھی منفرد بناتی ہے۔ غزل تو ہمارے اردو ادب کے اثاثہ کی آبرو ہے جس کے فدا صاحب امین ہیں، وہ لوگ ہماری تہذیب کی علامت تھے۔

سید حبیب اللہ بخاری۔ بہاولپور

''الاقرباء'' کا اپریل تا جون ۲۰۰۶ء کا شمارہ موصول ہوا، توجہ اور کرمفرمائی کا شکریہ۔

''معاصر ادب میں فکری اور نظریاتی اعتدال کی ضرورت'' کے عنوان سے آپ کا اداریہ برمحل اور صاحبان علم و دانش کے احساسات کا ترجمان ہے، بلاشبہ اس دور میں ہر شخص حصارِ ذات میں محصور نظر آتا ہے۔ مادہ پرستی نے ہمارے اذہان سے علمی نقصان کے احساس کو مٹا دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ زر ہی قاضی الحاجات ہے ہم اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ ہماری تہی دامنی ہمیں مذہبی اور قومی اعتبار سے جرأت و حمیت ایسے جواہر سے محروم کر دے گی۔

آپ نے فرمایا ہے کہ نئی نسل کو نہ درست سمت میں رہنمائی مل رہی اور نہ وہ سنجیدہ مطالعہ کی عادی ہے، سوال یہ ہے کہ ایسے بےلوث اور باذوق رہنماؤں کو کہاں تلاش کریں اور باشوق طالبان علم کو کہاں ڈھونڈیں؟ المیہ یہ ہے کہ درسگاہوں میں وہ اساتذہ میسر نہیں جو علمی و ادبی اور نظریاتی اقدار سے آشنا ہوں اور نہ انہیں اس کم مائیگی کے باوجود یہ احساس ہے کہ وہ نسل نو کی کس انداز سے رہنمائی کریں۔ علمی انحطاط کے اس دور میں شوقِ مطالعہ کے فقدان کی وجہ سے ہمارے کتب خانے ویران ہو کر رہ گئے ہیں۔ علم کے ان موتیوں کی نشاندہی اور ان سے استفادہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ آپ نے اپنے اداریہ میں اصناف ادب کی جن قابل قدر ہستیوں کے اسمائے گرامی تحریر فرمائے ہیں اور ان کی ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے، افسوس یہ ہے کہ ہماری نسل تو اُن سے واقف تک نہیں، چہ جائیکہ وہ ان کی گرانقدر تخلیقات سے مستفید ہونے کی جستجو کریں۔ بہر حال اس سلسلہ میں بھرپور کاوش و عمل کی ضرورت ہے، خدا کرے کہ آپ کے جذبات و احساسات سے ذہن بیدار ہو جائیں اور دلوں میں علمی انقلاب آ جائے۔

''تصوف اور اقبال'' کے موضوع پر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے بڑی عرق ریزی سے

عالمانہ حقائق واضح کیے ہیں جو ان کے عمیق مطالعہ اور وسعت فکر کو نمایاں کرتے ہیں۔

افتخار اجمل صاحب کا مضمون ''بنی اسرائیل اور ریاست اسرائیل'' اس قدر جامع، مدلل اور سہل نگاری کا مرقع ہے کہ تاریخی حقائق کے ذہن نشین ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

''دہلی میں پھول والوں کی سیر'' (خاکہ) جناب شفیع عارف دہلوی کی دیرینہ یادوں کی شمعیں روشن کرتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ صاحب مضمون نے اپنی یادوں کے پھول نذیر قارئین کیے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبالؒ کو سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آئی اور پکار اُٹھے

؎ سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

شفیع عارف صاحب کو دلی کیوں یاد نہ آئے۔ بہر حال ہم خوش بخت ہیں کہ انہوں نے دلی کی دلآویز زبان میں اپنی یادوں کے گلہائے شگفتہ سے ہماری روحانی مسرت کا بندوبست کیا۔ خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے۔ آمین

ڈاکٹر انور سدید صاحب نے برصغیر کی بے باک اور نابغہء روزگار شخصیت سے نسلِ نو کو متعارف کرایا۔ اپنے مشاہر کو یاد رکھنا اور ان کی علمی، ادبی کاوشوں اور اس دشت پر خار میں ان کے کارہائے نمایاں سے نسل نو کو آگاہ کرنا ایک بہت بڑی خدمت اور ضرورت ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دور استبداد میں جرأت و عزیمت کی شمعیں روشن کیں اور استعماری قوتوں کو لرزہ براندام رکھا اور آج ہم اپنی کم ہمتی کی وجہ سے خوفزدہ ہیں۔

''اردو ہماری قومی شناخت ہے'' اس موضوع پر جمیل یوسف کا مقالہ وقت کی ضرورت ہے کسی اجنبی زبان سے آشنا ہونا علمی اضافہ کے لئے ضروری ہے لیکن اپنی زبان سے روگردانی قومی بے حسی اور اپنے ادبی سرمایہ سے محرومی کا باعث ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج ہم اپنی زبان سے آشنا ہیں اور نہ انگریزی زبان سے کما حقہء واقف ہیں نظریہ پاکستان میں زبان اردو کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ قائد اعظمؒ اور ہمارے مشرقی حصہ کے صاحبانِ اقتدار نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ مگر یہ سب کچھ قصہء پارینہ ہو کر رہ گیا ہے۔ احساس زیاں کی اس کمی نے ہمارا قومی وقار مجروح کیا ہے۔ اردو سے بے رخی کو مستحکم کرنے کے لئے اسکی معاون زبانوں اور اساسی سرمایہ یعنی فارسی اور عربی کو نصاب سے ہی خارج کرنے کی جستجو جاری ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جناب حمایت علی شاعر اپنے مرسلہ میں رقمطراز ہیں کہ آج مغرب تمام علوم کا گہوارہ ہے اور ہمارا المیہ یہ ہے کہ علم ہمارے مدارس میں ہے اور نہ مسجد میں ہم پاکستانی مسلمان اپنی مقدس کتاب کی صرف تلاوت کرتے ہیں لیکن معنی سے ہمیں کوئی غرض نہیں، اسمیں انہوں نے علماء کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ بلاشبہ علمائے کرام کی کوتاہی ہے۔ لیکن غور طلب بات ہے کہ اس میں ہماری اپنی کوتاہی کو کتنا دخل ہے۔ ہم بحیثیت والد بحیثیت استاد اور معاشرے کے ایک حساس اور ''عالم وفاضل'' فرد کی حیثیت سے کس قدر اس کمی کو پورا کرنے کی جستجو کررہے ہیں ہمارے علماء کی اکثریت اب درسگاہوں کی بجائے سیاست کی تجربہ گاہوں میں مصروف عمل ہے۔ اس نے علمی تشنگی کو پورا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہ مذہبی وتہذیبی بے راہ روی کو روکنے کا کوئی عملی ثبوت دیا ہے۔ فرقہ واریت اور فروعی اختلافات کے بھنور سے ابھی تک نکلنے کی کوئی سنجیدہ تدبیر نہیں کی۔ اصلاح احوال کی اس سے کیا توقع کی جائے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے والے اپنے رسالے ترجمان القرآن میں اظہار فرمایا تھا کہ ملک میں آج دو گروہ موجود ہیں علما اور جدید تعلیم یافتہ پہلا گروہ قدیم راہوں سے آشنا ہے لیکن نظر وتدبر کے نئے تقاضوں سے آشنا نہیں۔ دوسرا گروہ نئے تقاضوں کی تشنگی رکھتا ہے لیکن قدیم راہوں سے آشنا نہیں اور نہ راہ کی مشکلات کی اسے خبر ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ معاملہ فہمی کی علمی نوعیت کا نہ تو پہلا گروہ انداز شناس ہوسکتا ہے نہ دوسرا اور بدقسمتی سے تیسرا گروہ مفقود ہے اور آخر میں لکھا ہے۔

یارب کجاست محرمِ رازے کہ یک زباں　　　　دل شرح آں دہد کہ چہ دیدو چہا شنید

حقیقت یہ ہے کہ آج کوئی گروہ بھی موجود نہیں لہٰذا جناب حمایت علی شاعر کو کوئی ایک ایسا گروہ تلاش کرنا ہوگا جو حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے عقل وشعور سے اس کمی کو پورا کرے موجود دور میں کسی کو موردالزام ٹھہرانے کی بجائے ذمہ دارانہ قیادت کا عملی ثبوت دینا ہوگا اور نہ پھر ہر ایک یہی کہتا رہے گا۔

جلوتیانِ مدرسہ کورنگاہ مردہ ذوق　　　　خلوتیانِ میکدہ کم طلب وتہی کدو

جناب اختر علی صاحب اختر چھتاروی کی نعت بزبان فارسی اور جناب عبدالعزیز خالد کی تظمین اشعار نعت حالی شاہکار ہیں خدا انہیں علم وحکمت کا مزید عرفان عطا کرے۔

مشکور حسین یاد کی غزلیں شاعری کی جدید راہوں کو اجاگر کررہی ہیں۔ سید انتخاب علی کمال کی نظم

''بیٹی'' خوب ہے نظم مرصع اور معنویت کے اعتبار سے اعلیٰ مقام کی حامل ہے۔ ''الاقرباء'' کا علمی و ادبی وقار اور نکھار مبارک ہو۔ اللہ آپ کو عافیت کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے۔ آمین

ڈاکٹر جمیل جالبی۔ کراچی

گرامی نامہ ملا جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ الاقرباء مجھے پابندی سے مل رہا ہے جس کے لیے مزید شکر گزار ہوں۔ اپنی زیر طبع کتاب کا ایک مضمون الاقرباء کے لیے ارسالِ خدمت ہے۔ الاقرباء اردو زبان و ادب کا ایک معیاری سہ ماہی ہے جس کا معیار ادب یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ آپ پابندی و محنت سے اسے شائع کر رہے ہیں اور یہی اس کی روز افزوں ترقی کا سبب ہے۔ خدا آپ کو صحت مند و سلامت رکھے۔

بشیر حسین ناظم۔ اسلام آباد

اس وقت الاقرباء سہ ماہی (اپریل۔ جون) راحت نظر و زینت انامل ہے جب سے اس علمی و ادبی و ثقافتی جریدہ مفیدہ و مفیضہ کا اجرا ہوا ہے۔ اسکی وجاہت کی اندرون، بیرون ملک دھوم مچی ہوئی ہیں اور اس کے محتوبات و مافیہات سے عارف و عامی مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ سب آپکی ذاتی دلچسپی کا کرشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ الاقرباء کی مقبولیت میں اضافہ بر افادہ فرمائے۔

فقیر ہر شمارے کو بہ امعانِ نظر پڑھ کر لطف اٹھاتا ہے اور کرب میں اس وقت مبتلا ہوتا ہے جب نظر سے عربی و فارسی دان حضرات کے تسامحات گزرتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ فیروز الدین احمد فریدی کے مضمون میں حضورﷺ کے ازواج مطہرات کے حجرات کو ہر جگہ جھونپڑی لکھا گیا ہے۔ شاید صاحب مضمون نے قرآن کریم کی سورۂ حجرات کا مطالعہ نہیں کیا جھونپڑی جھونپڑی کا بے ادبی کی حد تک اعادہ کیا ہے قرآن کریم نے ازواج مطہرات کے مساکن کو حجرات کا نام دیا ہے۔ جن کا انگریزی میں ترجمہ private apartments ہے۔ ان حضرات کا ذکر جمیل کرتے وقت کلک و قلم کے رہوار کو بے زمام نہیں ہونا چاہئے۔ رومی نے سچ کہا ہے: بے ادب محروم گشت از فضل رب۔

۲۔ مصنف مضمون نے حضور اکرمﷺ کے مرقد منور فریح مبارک کو قبر قبر لکھا ہے عزت بخاریؒ نے ہم لوگوں کو سمجھانے کے لئے اس شعر میں دلکش تلقین کی ہے

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

۳۔ نقشے میں بھی جابجا جھونپڑیوں کا ذکر ہے۔ اللہ توفیق ادب دے۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کے مقالہ (تصوف اور اقبال) میں مندرجہ ذیل نکات توجہ طلب ہیں:

۱۔ صرف شیخ شہاب الدین سہروردی لکھنے سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ ایک شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب سلسلہ بزرگ ہیں اور صاحب حکمت الاشراق شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول ہیں جنہیں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔

۲۔ حالت سکر سے narcotic مراد نہیں اس کا صحیح ترجمہ state of intoxication ہے صفحہ ۳۰

۳۔ فتوح الغیب میں کسی ستم ظریف نے تحریف کردی ہے ورنہ حضرت جنید بغدادی کے قول کے مطابق رضائے اسحاقؑ نہیں رضائے اسماعیلؑ ہے۔

حصہ نظم کے سلسلہ میں عرض ہے کہ:

۱۔ اختر علی خان چھتاروی صاحب نے اپنی فارسی نعت میں براق کو بُراق باندھا ہے جو غلط ہے۔ عُلو شانت کو عُلوئے شانت باندھا ہے۔

اس قسم کے اشعار کو ایڈیٹ کردینا چاہیے: ''وہاں تو وجد میں ہیں نغمائے لاہوتی۔۔۔ جہاں بہ پیش خدا شعر پڑھ رہا ہوں میں۔''

نظم بعنوان '' عفت موہانی''

۱۔ مجھے افسوس اور کربناک حیرت اس وقت ہوئی جب ایک مصرعے میں بالمشافہہ کو بالشافہ باندھا ہوا پایا۔ مشافہہ باب مفاعلہ سے ہے اسی سے مواجہہ ہے جسے ڈاکٹر ریاض مجید صاحب اکثر مواجہ باندھتے ہیں۔ حضرت عبدالعزیز خالد صاحب کو میں عربی زبان میں تمہر و تبحر کا حامل سمجھتا ہوں لیکن مشافہہ اور کبریا کو غلط استعمال کررہے ہیں۔ گزشتہ شماروں میں انہوں نے کبریا کا حبیب باندھا ہے شاید وہ کبریا کو خداوند قدوس کا نام سمجھتے ہیں ایسا نہیں کبریا صفت ہے۔ جیسے جلال صفت ہے اور ذوالجلال صفاتی نام ہے ویسے ہی الکبریاء صفت ہے اور ذوالکبریا اسم صفاتی ہے قرآن کریم میں لفظ الکبریا دو بار وارد ہوا ہے۔ ایک جگہ سورۂ یونس میں اور دوسری جگہ

سورۂ الجاثیہ وَلَہُ الکبریاءُ فی السّمٰوٰتِ والارض ۔زمین اور آسمانوں میں اسی کی بڑائی ہے۔تو پھر بڑائی کا حبیب کیا ترکیب ہوئی ۔الّا ماشاء اللہ تمام شعراء بشمول حضرت علامہ نے کبریا بمعنی اسم ذاتِ باری تعالیٰ باندھا ہے۔حضرت امام جعفر الصادقؑ سے مروی حدیث قدسی کے الفاظ یوں ہیں! الکبریاءُ ردائی فَمن کبّرَ فقد خاصمنی ۔بڑائی میری چادر ہے جس نے اپنے آپ کو مکبر کیا اس نے مجھ سے دشمنی پیدا کر لی۔لہٰذا حبیب کبریا محبوب کبریا، رسول کبریاء کی تراکیب معنوی لحاظ سے غلط ہیں۔حقیقت حال جاننے کے بعد ان تراکیب سے احتراز بہتر ہے۔

پروفیسر شریف کنجاہی ۔اسلام آباد

بھوپال صاحب کا مضمون اسرائیل اور ریاست اسرائیل پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں میں اس بات سے اتفاق نہیں کر سکا کہ اسرائیل سے خدا کا بندہ مراد ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ پرویزی لغات القرآن میں یہی مفہوم دیا گیا ہے کیوں کہ مولانا مودودی نے اس سلسلہ میں یوں اظہار خیال کیا ہے (بحوالہ القرآن جلد اول) ''اسرائیل'' سے مراد اگر بنی اسرائیل لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ نزول توراۃ سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے لی تھیں۔اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوب لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا۔'' یعنی اسرائیل سے بنی اسرائیل ہی مراد لیا جا سکتا ہے اور حضرت یعقوب اور بنی اسرائیل مرد الینے سے ضروری نہیں کہ ہم خدا کے بندے ہی مراد لیں۔

میرے گاؤں کے قریب ایک نگری کا نام ''اسرا'' ہے اور وہ پانی کے قریب ہے اسی طرح لاہور میں ایک معروف جگہ اچھرا ہے جسے میں راوی کی قدیم شاخ خیال کرتا ہوں ۔قیاس مجھے اس طرف لے جاتا ہے کہ کسی وقت اسرا اور اچھرا میں آبی حوالہ پایا جاتا تھا کہ س ش چھ ایک دوسرے سے بدل جانے والی آوازیں ہیں اور جسے ہم اسرا کہتے ہیں وہ کسی وقت ''اشرا'' ہوگا یا ''اچھرا'' ہوگا لیکن جب خدا پرست یہودی اپنے وطن سے بھاگ کر ادھر آئے تو اپنے عقیدہ کے مطابق انہوں نے اسے اشرائیل اچھرائیل بنایا ہو اس سے مراد یہ تھا کہ پانی اصل میں اللہ کی دین ہے ہمارے اپنے دور میں اقبال نے اسی سوچ کی تجدید کرتے ہوئے کہا تھا۔''پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون'' یہ میری سوچ ہے اور عام ڈگر سے ہٹی ہوئی ہونے کے باوجود توجہ طلب ہے۔ مجھے امید ہے کہ بھوپال صاحب ایک عالمانہ غیر جانب

داری کے ساتھ بات کی وضاحت کریں گے۔

حسن برنی۔ بلند شہر (بھارت)

میں آپکا از حد ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے موقر جریدہ۔ الاقرباء کے پچھلے کئی شمارے مجھے بھیجے تھے۔ 'الاقرباء' مجھے بہت پسند آیا۔ مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ 'الاقرباء نے نسبتاً کم عرصہ میں ہی ہندوستان و پاکستان سے جاری ہونے والے جرائد میں ایک منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔ 'الاقرباء' گوناں گوں ظاہری اور معنوی محاسن سے مزین ہے۔ اس میں شائع ہونے والے متنوع موضوعات پر مقالات و مضامین اور منظومات تحقیقی ثقافتی اور ادبی معیار کے لحاظ سے نہایت جاذبِ توجہ ہوتے ہیں اور چونکہ معیار پر خصوصی توجہ ہوتی ہے اس لئے اس میں قابل مطالعہ مواد بہت ہوتا ہے۔

محترمہ رابعہ لطیف برنی صاحبہ اور اویس جعفری صاحب جیسی ممتاز و معتبر اور فاضل شخصیتوں کی 'الاقرباء' سے وابستگی بذات خود ایک نیک شگون ہے اور اس کے بلند معیاری کی ضامن بھی۔ میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ 'الاقرباء' کا مستقبل تابناک ہو اور اسکی مقبولیت روز افزوں۔

محترمہ سعدیہ راشد۔ کراچی

سہ ماہی الاقرباء شمارہ اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء موصول ہوا۔ اس علمی تحفے کے لئے میں تہہ دل سے آپ کی شکرگزار ہوں۔ الاقرباء کا ہر شمارہ قارئین کی علمی اور ادبی تشنگی کی تسکین کا باعث ہوتا ہے لیکن یہ شمارہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں جریدے کے پانچ سال مکمل ہونے پر منعقد ہونے والی تقریب اور تقسیم اعزازات کا پورا احوال بھی ہے۔ میں بھی اس تقریب میں شریک تھی اور اس موقع پر میں نے جو باتیں کہی تھیں، وہ بھی اس شمارے میں شائع ہوئی ہیں۔ تقریب میں آپ نے از راہ کرم ''الاقرباء'' کے گزشتہ پانچ سال کے شماروں پر مشتمل پانچ جلدیں بھی عنایت کیں جن کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ جریدے کی پذیرائی میں روز بروز اضافہ فرمائیں اور اس کے ذریعے سے علم و ادب کی خدمت ہوتی رہے۔ آمین

اکبر حیدرآبادی۔ (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

الاقرباء کا اپریل تا جون کا شمارہ موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ تشکر کے ساتھ ساتھ معذرت کا

طالب ہوں کہ لکھنے میں تاخیر ہوگئی جس کا سبب کچھ خرابی صحت اور کچھ غیر متوقع مصروفیات تھیں۔ تاہم میں اپنے کرم فرما بیرسٹر سلیم قریشی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یاد دہانی فرمائی۔ سب سے پہلے الاقرباء کی پانچویں سالگرہ پر میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ اس میں کیا شک کہ الاقرباء ایک موقر معیاری جریدہ ہے جو شعر و ادب کی اعلیٰ اقدار کا نقیب ہے۔ زیر نظر شمارے میں تمام مقالے اور مضامین عالمانہ اور معلوماتی نوعیت کے ہیں۔ فیروز الدین احمد فریدی صاحب نے نبی کریمؐ کی آرام گاہ کی نسبت سے امہات المومنین کی رہائش گاہوں کے بارے میں جو تفصیلات فراہم کی ہیں وہ ہماری معلومات میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے اپنے مقالے میں تصوف کے ضمن میں اقبال اور دوسرے مفکرین کی آراء پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں پر ڈاکٹر انور سدید کا مضمون بھی مطالعہ نواز ہے۔ گوشہء الاقرباء میں معروف اہل قلم کے کوائف سے آگہی حاصل کر کے خوشی ہوئی۔ منظومات کا حصہ بھی مجموعی اعتبار سے دلنشیں اور جاندار ہے۔

محمد اویس جعفری (سیاٹل۔ امریکہ)

یوں تو ہر شمارہ منفرد ہوتا ہے لیکن تازہ تر بہت ممتاز نظر آتا ہے اس ضمن میں قارئین کے مراسلات میری رائے کی تائید کرینگے۔ ممکن ہے آپ کو اس امر کا اندازہ ہو کہ اس دور کے ادب میں یہ مجلّہ ایک تاریخ ساز حیثیت کا حامل ہے۔ عطائے اعزازات کی تقریب کی روداد پڑھ کر شمولیت کا لطف بھی آیا اور غیر حاضری کا بھی شدید احساس ہوا۔ ان تمام اہل قلم کو تہنیت جن کو اعزازت نے گلے لگایا۔ تقسیم کاری کے لئے بھی آپ نے مروجہ روش سے ہٹ کر ایک ادبی اور علمی شخصیت کا انتخاب کیا' کاش اس روایت کو مقبولیت اور دوام حاصل ہو۔ ''جہاں حضورؐ آرام فرما ہیں'' قابل صد ستائش تحقیقی مضمون ہے اس موضوع پر جزئیات اور اس قدر تفصیل لائق ستائش ہے' صاحب مضمون مبارکباد کے مستحق ہیں۔ نصف صدی سے کچھ اوپر صیہونی ریاست کے پس منظر' قیام' دہشت گردی' حق تلفی' انسان کشی' ناانصافی اور ظلم دھاندلی کی المناک داستان کی جناب افتخار احمد نے بہت خوب کوزہ بندی کی ہے۔ ہر چند کہ یہ ریاست اندرونی خلفشار اور انتشار کا شکار ہے لیکن جنگی جنون اس کے عوام کو متحد رکھتا ہے اور بیرونی پشت پناہی اور مالی امداد کی بیساکھیاں اس کی بقا کی ضامن ہیں۔ اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو صیہونیوں کی عالمگیر چودھراہٹ کے پس پشت ان کی علمی برتری کارفرما ہے جس کا منفی استعمال' ان کے قومی فلسفہ کی جان

ہے۔ایک پاکستانی صحافی کے قول کے مطابق گزشتہ ۱۰۵ سالوں میں یہودیوں نے ۱۸۰ نوبل پرائز حاصل کئے ہیں جبکہ ان کی تعداد ۱۴ ملین ہے اس کے برعکس گو مسلمانوں کی تعداد ۱۰۴ ابلین ہے لیکن انہوں نے صرف تین نوبل پرائز حاصل کئے ہیں۔ان کی شرح خواندگی ساری اقوام کے مقابلہ میں زیادہ بتائی جاتی ہے۔صحافت، قانون، طب، تعلیم، بنکاری، صنعت وحرفت، تجارت غرض کوئی شعبہ لے لیجئے سب پر ان کا تسلط ہے۔ذرائع ابلاغ پر تو ان کا سو فیصد قبضہ ہے۔نبی کریمؐ کی ایک حدیث کے مطابق ''علم مومن کی گمشدہ میراث ہے اور اس پر اس کا حق سب سے زیادہ ہے۔''مسلمان ممالک کی شرح خواندگی افسوسناک ہے، جب تک ہم اس طرف توجہ نہیں دیں گے ہم اپنے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتے۔

''دہلی میں پھول والوں کی سیر'' توجہ شکار مضمون میں بعض جگہ رنگ، تغزل نمایاں ہے۔بہت سے گم شدہ الفاظ کی بازیافت کا سہرا محمد شفیع عارف صاحب کے سر ہے۔حالیہ شمارہ میں خاکے اور افسانہ کے علاوہ اختر علی اختر صاحب کی نعت میں الفاظ کے انتخاب نے ایک نغمگی پیدا کر دی ہے۔عبدالعزیز خالد صاحب کی تضمین الفاظ کے در و بست پر ان کی گرفت کی غماز ہے۔''ہمارا کیا ہے'' لطیف و سبک نظم ہے۔مراسلات میں جناب ڈاکٹر انیس قدوائی اور جناب بیرسٹر سلیم قریشی کی ہمت افزائی کے لئے شکر گزار ہوں اور جناب محمود رحیم صاحب کی تصحیح کے لئے ممنون ہوں۔مصرع یوں ہونا چاہئے تھا۔

''رجز کہیں پہ ہیں غازیوں کے کہیں پہ بکھری ہوئی اذانیں''

اس شمارہ میں میری غزل کا یہ شعر کاتب کی بے نیازی سے شکوہ سنج ہے۔

عجیب شہر ہے کشکول دل رہا خالی ۔ ہر اک گلی میں ہر اک در پہ ہم پکار آئے

''نقد و نظر'' کا شعبہ نئی اور اچھی کتابوں کے تبصرہ کا آئینہ دار ہے۔تبصرہ بہت جان لیوا اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ان کتابوں کا حصول مجھ جیسے دور افتادہ لوگوں کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ناشر حضرات کے پاس سے جواب نہیں آتا۔کاش اس کا آپ کوئی حل تجویز کر سکیں۔شکریہ

AL-Aqreba wins appreciation abroad

(Review by Dr. Afzal Mirza appearing in Weekly 'Pakistan-Link' in its issue of 18th April, 2006 published from America)

It goes to the credit of former bureaucrat Syed Mansur Aquil that magazine Al-Aqreba is being regularly published without compromising its literary and aesthetic standard. The present is the annual issue, which possesses all the ingredients of a serious literary journal.

In the last few issues the editor had started writing some profound editorials on various literary issues but this time he has justifiably taken up the earthquake and its aftermath as his subject. It becomes far more relevant because the magazine is published from Islamabad which was also severely hit by the quake and this had a deep impact on the psyche of the literati of that area. This is the reason why he has earmarked a separate section in the magazine on the writings pertaining to this devastating happening under the heading "Qahar Ashob." The section includes some passionate contributions by Muhammad Shafi Arif Dehlvi, Naeem Fatima Alvi, Mahmood Akhtar Saeed and moving poems by Amin Rahat Chughtai, Saifur Rehman Saifi and Shahida Lateef. Both the short stories in the section, especially the one by Mahmood Akhtar Saeed entitled' Koi School Ki Ghanti Baja De;evokes compassionate feelings for the victims of the tragedy: As usual this time as well the section 'Mazameen' is the strongest and the contributors ae Dr. Mohammad Mueezuddin, Dr. Ghulam shabbir Rana, Dr. Shahid Hasan Rizvi, Dr. Khayal Amrohvi, Dr. Muzammil Bhatti, Qamar Rueeni and Prof. Mashkoor Hussain Yaad. In his article Dr. Muez has described the importance of Iqbal and his philosophy and poetry in present-day Persia. The writer rightly points out that Iqbal's interest in Iran could be seen from the subject of his thesis "Development of Metaphysics in Persia". He has also tried to explain the reason why Iqbal did not do his Doctorate from Cambridge by saying that before 1921 Cambridge had not started awarding PhD Degrees, that is why Iqbal submitted the thesis to Munich University and learnt the German language. He has however not explained what Iqbal was doing at Heidelberg University. He also reveals that Iqbal switched over to writing poetry in Persian Language on the suggestion of his friend Sir Abdul Qadir.

Dr. Muzammil Bhatti has contributed an interesting article on Islamic Calligraphy. She has traced the origin of Islmic Calligraphy to the times of the Holy Prophet when his companions Jotted down God's message. This art then reached Medina from Makka. The first calligrapher was Zaid ben Haris and the first to write bismillah was Khalid bin Saeed Abu Al-Aas. She also points out that Hazrat Ali was also a good calligrapher of the Koofi script. Among the present day calligraphers she has given the names of Aslam Kamal, Zawwar Hussain, Abdul Wahid, Sadequin, Gul Jee and others forgetting to mention. Haneef Ramay. Syed Intikhab Ali Kamal's lengthy article on Allama Seemab Akbarabadi is also worth mentioning. He has shed light on hitherto unknown aspects of the personality of this popular poet of the first half of last century. Seeab Sahib got his poems corrected by Daagh Dehlvi and among his well-known protégés was famous poet Saghar Nizami.

Abdul Hamid Aazmi who retired from a senior position in Radio Pakistan a few years ago now devotes most of his time in research. Last time he had un-veiled the mystery of Maulvi Madan. This time he has dug out the background of Mian Miskeen, a poet and rival of Mirza Rafi Sauda whom Sauda had mentioned in one ofhis Hijvis in the line: "Phir koi no pooche Mian Miskeen Kahan ho" He writes that Miskeen was a prolific Marsiya writer who migrated to Calcutta when Nawab Wajid Ali Shah was interned there. In the poetry section one finds the names of Abdul Aziz Khalid, Shabnam Roomani, Muztar Akbarabadi, Saifur Rehman Saifi, Dr. Khayal Amrohvi, Karamat Bokhari, Amin Rahat Chughtai and Anwaar Feoze. Poet Owais Jafery who lives in America has written a meaningful poem entitled 'Mere Qabeele Mein Aane Wali? The poet has addressed this poem to an American white girl who has married a Pakistan Muslim and has beautifully described to her the character of the person she has married and the shape of the social structure she would be entering which was totally different from the one she had been living in. The magazine also carries the critical reviews penned by Syed Mansur Aquil on the latest books of Rabia Burney, Khayal Afaqi and Mashkoor Hussain Yaad.

Conquering new Frontiers

Entering in the World of Progress
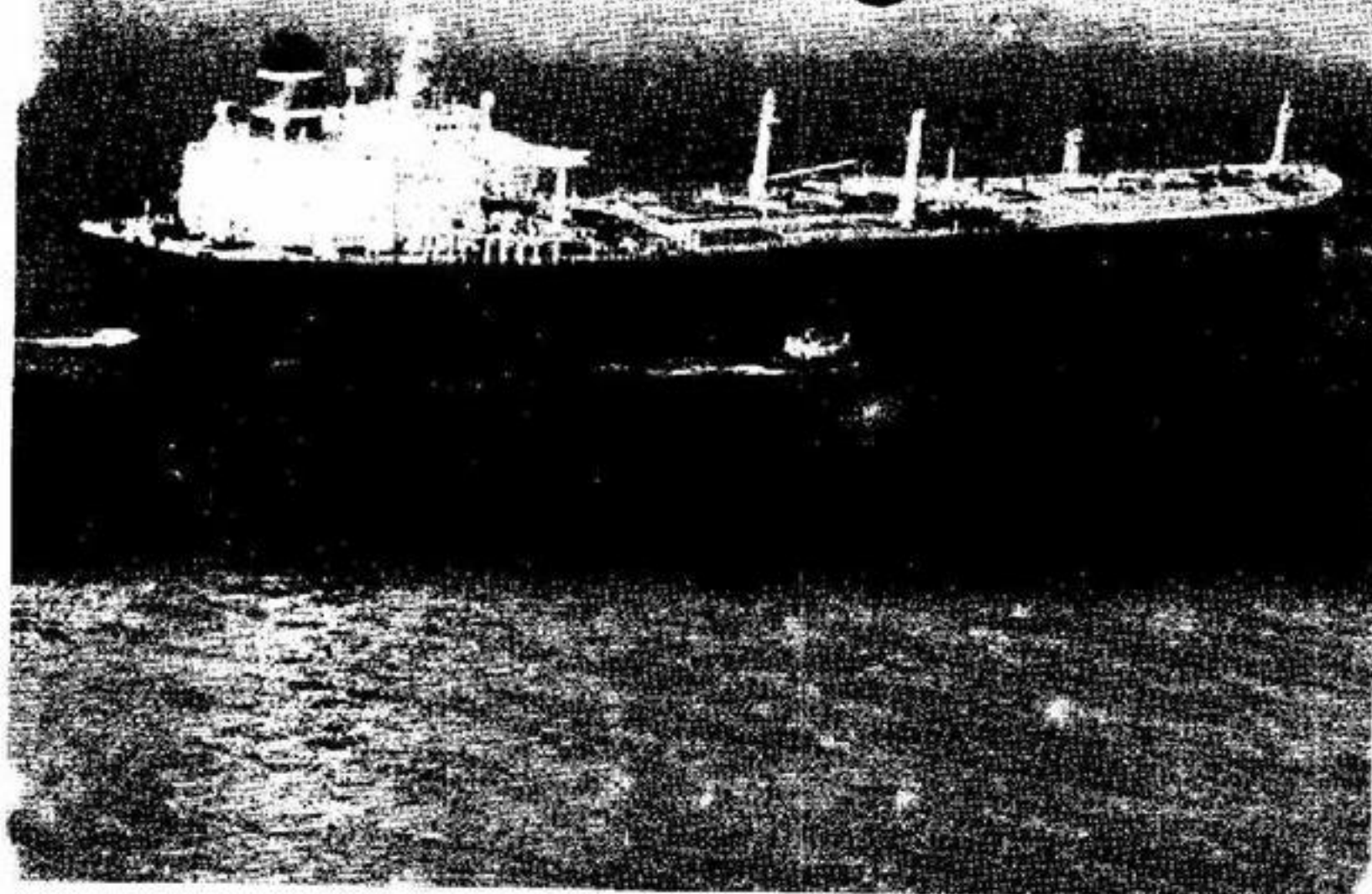
خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)
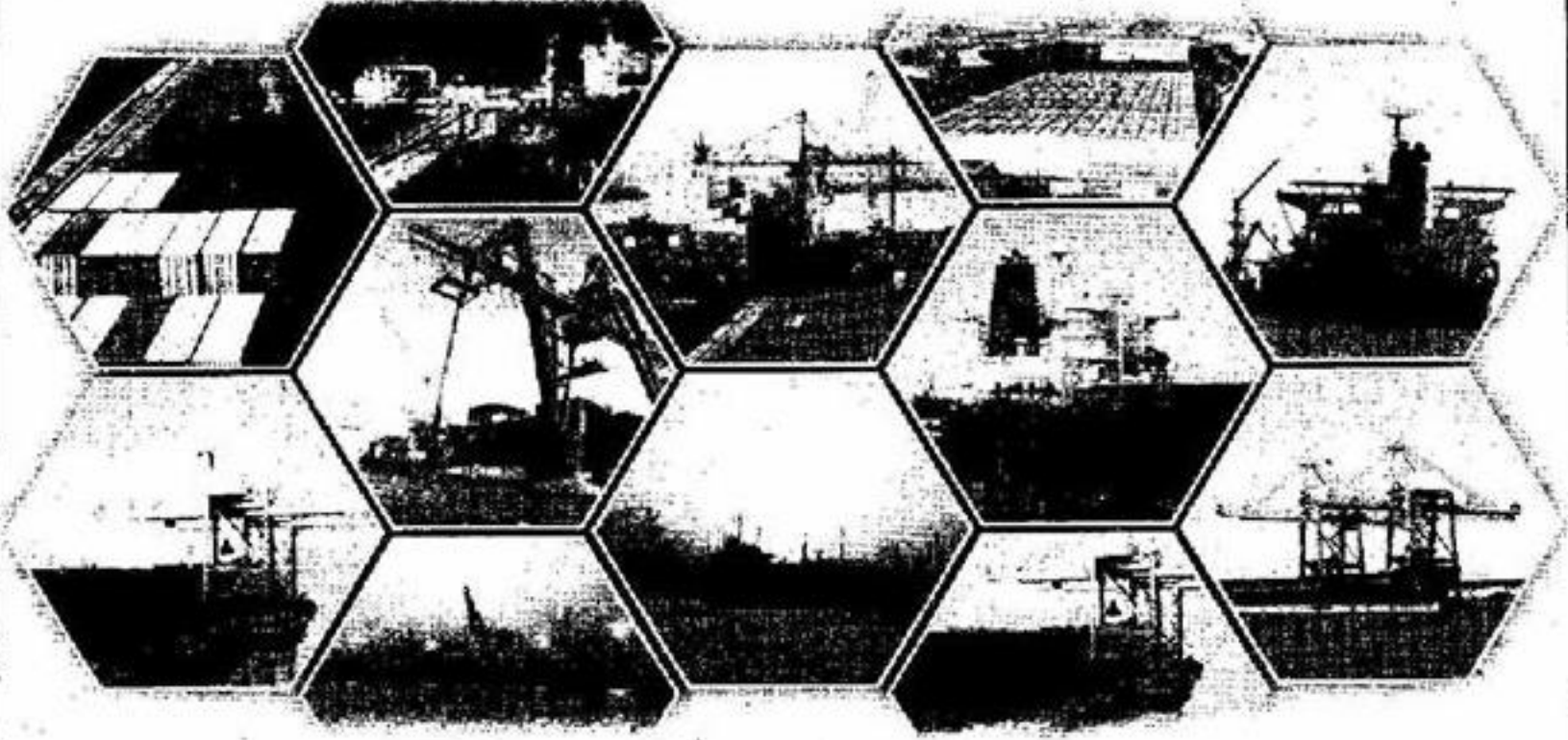
مرتبہ:
شہلا احمد

احوال وکوائف

○ دنوئی ریسٹ ہاؤس کے حسین سبزہ زار پر پکنک:

مورخہ ۲۳ اپریل ۲۰۰۶ء بروز اتوار الاقرباء فاؤنڈیشن نے دنوئی ریسٹ ہاؤس کے حسین سبزہ زار پر پکنک کا اہتمام کیا جس میں اراکین فاؤنڈیشن ان کے اہل خانہ اور کئی مہمانان گرامی نے شرکت کی اور وہاں کے دل موہ لینے والے قدرتی مناظر اور مسحور کن فضاؤں سے خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔

○ مجلس عمومی کا ہنگامی اجلاس:

پکنک کے موقع پر صدر الاقرباء فاؤنڈیشن محترم سید منصور عاقل نے مجلس عمومی کے ارکین کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے' اور اپنا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے تمام ممبران کی متفقہ رائے سے ایوان میں سینئر نائب صدر کے عہدہ کا اضافہ کیا اور محترم سید ممتاز اللہ سالاری کو نائب صدر سے سینئر نائب صدر کے عہدہ پر فائز کر دینے کا اہتمام کیا' جبکہ نائب صدر کیلئے شہلا احمد یعنی راقم الحروف کا نام اراکین کے سامنے رکھا گیا جو اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا گیا۔

○ بیگم طیبہ آفتاب کی امریکہ سے واپسی اور دوبئی روانگی

بیگم طیبہ آفتاب جو مجلس انتظامیہ کی اعزازی رکن ہیں گزشتہ دنوں امریکہ تشریف لے گئی تھیں' آپ کا وہاں تقریباً چھ ماہ قیام رہا' جو انہوں نے اپنے صاحبزادے' بہو اور پوتا پوتیوں کے ساتھ خوشبوں اور مسرتوں کے درمیان گذارا۔ گزشتہ دنوں وہ پاکستان تشریف لائیں اور تقریباً ایک ہفتہ یہاں رہ کر مورخہ ۳ جولائی ۲۰۰۶ء کو دوبئی روانہ ہو گئیں۔ وہاں وہ اپنے دوسرے صاحبزادے' بہو اور پوتے کے ساتھ قیام کریں گی۔ ہماری دعا ہے کہ وہاں بھی ان کا وقت خوشیوں' مسرتوں اور صحت وتندرستی کے ساتھ گذرے۔ آمین

○ ولادت فرزند

عمران سید کو جو محترمہ بیگم طیبہ آفتاب کے فرزند اکبر ہیں اور امریکہ میں رہائش پذیر ہیں اللہ تعالٰی نے ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا ہے۔ پیدائش ۲۴ مئی بروز بدھ ۲۰۰۶ء کو ہوئی۔ نومولود کا نام سیف اللہ رکھا گیا ہے۔ ادارہ اس موقع پر بیگم آفتاب، عمران سید و نجلہ سید کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرزند کی خوش بختی اور درازی عمر کیلئے دعا گو ہے۔

ریحان سید کو بھی جو بیگم طیبہ آفتاب کے فرزند اصغر ہیں اللہ عز وجل نے دولتِ فرزند کی خوشی عطا فرمائی ہے۔ نومولود کی پیدائش ۱۲ اپریل ۲۰۰۶ء بروز بدھ ہوئی۔ ان کا نام میکائل سید رکھا گیا ہے۔ ادارہ اس مبارک موقع پر بیگم طیبہ و ریحان سید و روشانہ سید کو جو دوبئی میں بسلسلہ ملازمت رہائش پذیر ہیں دلی تہنیت پیش کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالٰی بچے کی عمر دراز کرے اور نیک و صالح بنائے۔ آمین

○ سانحات رحلت

مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن اور سہ ماہی الاقرباء کے مدیر منتظم جناب سید ناصر الدین کی بھابھی محترمہ طاہرہ صاحبہ گزشتہ دنوں بھاولپور میں انتقال فرما گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۸۵ برس تھی اور وہ تقریباً چار سال سے بوجہ فالج صاحبِ فراش تھیں۔ پسماندگان میں پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں جو سب شادی شدہ ہیں۔ ان کے شوہر ۹ سال پہلے ہی وفات پا چکے ہیں۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور فاؤنڈیشن پسماندگان، جناب ناصر الدین اور دیگر عزیز و اقارب کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالٰی سے مرحومہ کی مغفرت و بلند درجات کیلئے دعا گو ہیں۔

○ محترم سید گوہر علی رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کی اہلیہ محترمہ کی بڑی ہمشیرہ ممتاز حامد صاحبہ گزشتہ دنوں ۱۴۔ اپریل ۲۰۰۶ء ملتان میں خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کافی عرصہ سے بریسٹ کینسر میں مبتلا تھیں۔ پسماندگان میں شوہر جناب سید حامد علی شاہ میر جو وکالت کے پیشے سے وابستہ ہیں، کے علاوہ دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ سب بچے شادی شدہ ہیں۔ غم کی اس گھڑی میں ادارہ سہ ماہی الاقرباء جملہ متعلقین ولواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحومہ کی مغفرت اور بلند

درجات کیلئے دعا گو۔ اللہ تعالیٰ تمام اقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

○ محترم سید محمد ذکاء اللہ جو راقم الحروف شہلا احمد، چیف ایڈیٹر سہ ماہی الاقرباء و نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کے بڑے بہنوئی تھے، ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء بروز پیر وفات پا گئے۔ ان کی عمر ۶۴ برس تھی ۲۵ سال سے گلف نیوز دوبئی میں بطور آرٹ ڈائریکٹر فرائض منصبی انجام دے رہے تھے۔ تین ماہ پیشتر ہی اپنی بڑی صاحبزادی کے پاس کراچی تشریف لائے تھے کہ شدید بیمار ہو گئے۔ اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ جو سب شادی شدہ ہیں۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحوم کی مغفرت و بلند درجات کے لئے دعا گو۔ اللہ تعالیٰ جملہ لواحقین و پسماندگان کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔ آمین

تعلیمی شعبہ میں کامیابیاں و کامرانیاں:

○ اریبہ تلمیذ صدر محترم سید منصور عاقل صاحب کی پوتی اور سلمان منصور و سارہ منصور کی ہونہار صاحبزادی ہیں۔ گزشتہ کی طرح اس سال بھی امتحانات میں ان کی کارکردگی شاندار رہی اور کلاس ون کا امتحان انہوں نے ہر مضمون میں A لے کر پاس کیا۔ ان کا اسکول کی بہترین طالبات میں شمار ہوتا ہے۔ اس موقع پر ادارہ دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔

○ ارسلان منصور الاقرباء فاؤنڈیشن کے تاحیات رکن جناب فیصل منصور و نادیہ منصور کے صاحبزادے اور جناب صدر سید منصور عاقل کے سب سے بڑے پوتے ہیں۔ انہوں نے نیشنل ماڈل ہائی اسکول شیخوپورہ سے اس سال کلاس چہارم کا امتحان ماشاء اللہ اسّی فیصد (80%) نمبروں کے ساتھ پاس کیا ہے۔ ادارہ سہ ماہی اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

○ ایمن منصور نے جو ارسلان منصور کی چھوٹی بہن ہیں، اس سال کلاس دوئم پاس کی ہے۔ انہوں نے 94% نمبر حاصل کئے ہیں۔ یہ بھی نیشنل ماڈل ہائی اسکول شیخوپورہ میں زیر تعلیم ہیں۔ ادارہ سہ ماہی کیطرف سے دلی مبارکباد۔

○ تزئین منصور بھی جناب صدر کی پوتی اور جناب فرحان منصور و بیگم عائشہ فرحان کی ہونہار

صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے اس سال OPF اسکول سے پریپ کلاس پاس کی ہے اور بہت سارے As حاصل کیئے ہیں۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء کی جانب سے دلی مبارکباد

O رمان جان اطہر مجلس عمومی الاقرباء فاؤنڈیشن کے ممبر جناب اطہر اسلام احمد ومریم اطہر کے صاحبزادے اور شہلا احمد مدیر مسئول سہ ماہی الاقرباء کے پوتے ہیں۔ انہوں نے اس سال اسلام آباد کانونٹ اسکول سے پری پرائمری پریپ کلاس 92.5% نمبر حاصل کر کے A-1 گریڈ میں پاس کی ہے۔ اس سلسلے میں اسکول کی طرف سے اسلام آباد کلب میں دو گھنٹے ''کا گریجویشن ڈے'' پروگرام منعقد کیا گیا۔ جس میں کامیاب بچوں نے گاؤن اور ہڈ کے ساتھ گریجویشن پریڈ کی۔ رمان جان نے اس اہم تقریب میں Value awards کا 'Most Friendly' سرٹیفکیٹ پری پرائمری پاس کی ڈگری اور کلاس میں Out -standing performance کا میرٹ سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ ادارہ سہ ماہی اس شاندار کامیابی پر انہیں ان کے ممی پاپا اور دادی جان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

O سیدہ وجیہہ مزمل سالاری الاقرباء مجلس منتظمہ کے رکن جناب مزمل اللہ سالاری وڈپٹی سیکرٹری جنرل محترمہ ہما سالاری کی ہونہار صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے اس سال Presentation کانونٹ ہائی اسکول راولپنڈی سے کلاس ہشتم اوّل پوزیشن میں پاس کی ہے جبکہ پورے اسکول میں یہ دوسرے نمبر پر رہی ہیں۔ انہیں کی چھوٹی بہن سیدہ حلیمہ مزمل سالاری نے اس سال اسی اسکول سے اوّل پوزیشن لے کر کلاس چہارم میں کامیابی حاصل کی ہے جبکہ پورے اسکول میں وہ تیسری پوزیشن پر رہیں۔ دونوں بہنوں نے ''Best in English'' کے سرٹیفکیٹ حاصل کیئے ہیں۔ اس شاندار کامیابی پر ادارہ سہ ماہی دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

O سید غضنفر سالاری کی شاندار کامیابی واعزاز:

الاقرباء فاؤنڈیشن کے مشیر قانونی جناب سید ظفر اللہ سالاری وبیگم نیر سالاری کے ہونہار صاحبزادے عزیزی غضنفر کی ''Nust'' کے داخلہ ٹیسٹ میں بھی کارکردگی بہترین رہی۔ اس ٹیسٹ میں پورے پاکستان سے ہزاروں طلباء وطالبات نے حصولیا، جن میں غضنفر میاں نے تیئسویں (23rd) پوزیشن حاصل کی اور شاندار کارکردگی کا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھا۔ اس اعزاز پر انہیں اسکالرشپ کا بھی

اہل قرار دیا گیا ہے۔اور الیکٹریکل انجینئرنگ میں ان کا داخلہ ہو گیا ہے۔ادارہ اس اعلیٰ ترین کامیابی پر انہیں اور تمام اہل خانہ کو تہنیت پیش کرتا ہے۔

O سیدہ مریم احمد کا اعزاز:

ادارہ سہ ماہی الاقرباء سیدہ مریم احمد جو سیکرٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن سید نعیم احمد و بیگم عظمیٰ احمد کی صاحبزادی ہیں کو NUST میں داخلہ پر دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔مریم احمد EMS اسکول کی بہترین طالبہ رہی ہیں ۔بیکن ہاؤس سے اے لیول (A level) کا امتحان دے چکی ہیں۔گزشتہ دنوں وہ NUST کے داخلہ ٹیسٹ میں شریک ہوئیں اور پورے پاکستان سے شریک ہزاروں طلباء میں ۸۷ ویں پوزیشن پر کامیاب قرار دی گئیں۔

شہلا احمد

فطرت کے حسین و دلکش مناظر کے درمیان یادگار ساعتیں

گزشتہ برس پے در پے کچھ ایسے حالات و واقعات درپیش رہے کہ الاقرباء فاؤنڈیشن اپنے اراکین کے لئے کوئی بھی تفریحی پروگرام ترتیب نہ دے سکی۔ لیکن وقت کے مرہم نے آخر کار آہستہ آہستہ زخموں کو مندمل کر دیا۔ کہ یہ ہی قانون قدرت ہے۔ زلزلہ کی تباہ کاریوں کا پوری قوم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور متاثرین کی دل و جان سے خدمت کی۔ الاقرباء فاؤنڈیشن بھی مشکل کی اس گھڑی میں اپنے متاثرہ ہم وطنوں کے چہروں پر مسکراہٹیں سجانے اور خوشیاں بانٹنے کے لئے سب کے شانہ بشانہ کھڑی رہی۔۔ حالات سنورنے اور فضاء بہتر ہونے پر فاؤنڈیشن نے ایک بار پھر اپنے اراکین کی طرف توجہ مبذول کی اور انہیں ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے پکنک کا پروگرام بنا ڈالا تا کہ وہ کچھ وقت ایک ساتھ ہنستی مسکراتی رفاقتوں کے درمیان گزار سکیں۔ پکنک کے لئے جگہ کا انتخاب مجلس منتظمہ کے اراکین کی متفقہ رائے سے کیا گیا۔ کوٹلی ستیاں کے قریب واقع ''دنوئی ریسٹ ہاؤس'' کو سب نے پسند کیا۔ یہ ایک خوبصورت دل پر فضاء مقام ہے۔ آسمان سے باتیں کرتے بلند و بالا سایہ دار درخت، وسیع و عریض سبزہ زار اور اطراف میں پہاڑیوں کا سلسلہ منظر کو چار چاند لگاتے ہیں۔ حسین و دلکش قدرتی مناظر سے گھرے اس ریسٹ ہاؤس کی تعمیر ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی ایک ہزار چار سو اڑتیس (۱۴۳۸) میٹر ہے۔ یہ بلاک ہیڈ کوارٹر کامرہ سے چار کلومیٹر پہلے یعنی راولپنڈی سے تقریباً اٹھاون (۵۸) کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت ایل (L) کی شکل میں بنی ہوئی ہے۔ دو بیڈ روم، ملحقہ غسلخانے، ایک طرف فارسٹ افسران کے دفتری استعمال کے لئے کمرہ، چھوٹی سی پینٹری جس میں کھانے کی میز رکھی گئی ہے، کمروں کے سامنے لمبا سا برآمدہ اور اسی کے ایک طرف چھوٹا سا سن روم (Sun Room)۔۔۔ ایک مناسب اور اچھی جائے پناہ تفریح کے لئے آنے والوں کے واسطے اچانک بدلتے موسم کی سختی سے بچاتی ہے۔۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر محکمہ جنگلات پنجاب جس کی زیر نگرانی یہ عمارت ہے،

اس کی صفائی ستھرائی، پانی اور روشنی وغیرہ کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ دے سکے۔

باہمی گفت وشنید اور پکنک کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد پروگرام کو حتمی شکل دیتے ہوئے اتوار مورخہ ۲۳ اپریل ۲۰۰۶ء کا دن متعین کر دیا گیا۔ سیکرٹری جنرل سید نعیم احمد نے حسب دستور مقررہ دن سے کافی پہلے تمام ممبران فاؤنڈیشن کو پکنک کے حوالے سے خطوط معہ ضروری تفصیلات پوسٹ کر دیئے اور تاکید کی کہ شرکاء اپنے اہل خانہ اور مہمانوں (اگر وہ لانا چاہیں) کے ہمراہ اپنی اپنی ٹرانسپورٹ میں اتوار کی صبح ٹھیک 9 بجے راول ڈیم چوک سے چک شہزاد روڈ پر جمع ہو جائیں۔ پابندی وقت کا خاص خیال رکھا جائے تا کہ وہاں سے یہ کارواں ٹھیک سوا نو بجے منزل مقصود کے لئے روانہ ہو سکے۔ تقریباً نو بجے جب ہم مقررہ پوائنٹ پر پہنچے تو نعیم واہل خانہ کو منتظر پایا۔ سلام ودعا کے بعد انہوں نے ہمیں گاڑی آگے لے جا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نرسری کے برابر میں گاڑی پارک کی اور باہر آ کر خوبصورت پودوں اور پھولوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ یہاں جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ سجاد اور بھائی مسیح شیخ و بیگم شیخ پہلے ہی سے موجود تھے ہم نے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی اور وقت گزاری کے لئے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ سب ہی شرکاء اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں پہنچ گئے اور گاڑیوں سے اتر کر سلام ودعا کرتے ہوئے مسکراتے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی۔ بچے تو جیسے ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے اور گاڑیوں سے اتر کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا۔ کچھ بڑوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پھولوں کی نرسری کی سیر کر ڈالی۔ اور خوبصورت پودوں اور رنگین پھولوں کی خوشبو سے دل و جان کو معطر کیا اور روح کو تازگی بخشی۔ سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ حیران و پریشان ہماری گاڑیوں کے قافلے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر یہ اتنی ساری گاڑیاں سڑک کے کنارے جمع کیا کر رہی ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی پرواہ کب تھی۔ ہم تو ہرے بھرے درختوں کی چھاؤں میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ فرحان میاں کی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کی گاڑی میں حلوہ پوری تیار کرنے والے حضرات آ رہے تھے۔ آخر وہاں جا کر پیٹ پوجا بھی تو کرنی تھی۔ ابھی انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ '۱۵' کی ٹیم آ پہنچی۔ انہوں نے بڑے اخلاق اور مودبانہ انداز میں ہم سے ہمارا مسئلہ پوچھا اور مدد کی پیشکش کی ہم نے اصل بات بتاتے ہوئے ان کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی پولیس کے

اس جذبہ خیر سگالی پر ہمیں یک گونہ خوشی محسوس ہوئی ۔ جیسے ہی فرحان میاں کی گاڑی پہنچی منصور بھائی نے نعیم احمد کو روانگی کا اشارہ کیا ۔ اور یوں تقریباً دس بجے اٹھارہ گاڑیوں پر مشتمل یہ کاروان اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا ۔ فرحان میاں و نعیم احمد کی گاڑیاں سب سے آگے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہی تھیں ۔ گرمی کی شدت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود یہ قافلہ شاداں و فرحاں قدرتی مناظر اور گاڑیوں میں لگے میوزک سے لطف اٹھاتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا ۔

ہمارے ایک طرف اونچی پہاڑیاں اور دوسری طرف گہری کھائیاں تھیں ۔ پہاڑی ڈھلانوں پر بنے مکانات دور سے گڑیوں کے گھروندے لگ رہے تھے ۔ کہیں کہیں ہموار قطعات پر وہاں کے باسیوں نے اپنی ضرورت کے مطابق گندم اور سبزیاں وغیرہ کاشت کی ہوئی تھیں ۔ انہیں ڈھلانوں پر جگہ جگہ پولٹری فارم بھی نظر آئے ۔ لیکن سب کے سب ویران غالباً برڈ فلو کی نذر ہو گئے تھے بڑا دکھ ہوا یہ سب کچھ دیکھ کر پتہ نہیں اس بزنس سے متعلق کتنے لوگ متاثر ہوئے ہوں گے بہرحال مختلف مناظر کو آنکھوں میں سموتا گاڑیوں کا یہ قافلہ ایک قطار کی شکل میں آگے اور آگے ہی بڑھتا رہا ۔ جب کوئی گاڑی کسی گاڑی سے آگے نکل جاتی تو نوجوان اور بچے خوشی سے بے حال ہو جاتے اور پیچھے رہ جانے والوں پر خوب خوب پھبتیاں کستے ۔ سلمان اور فرمان کی گاڑیاں تو راستے میں کئی دفعہ رک رک کر پتہ نہیں کیا رد بدل کرتی رہیں ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سالن کی پتیلی بار بار ڈانواں ڈول ہو کر احتجاج کرتی کہ رک جاؤ ورنہ میں گر جاؤں گی ۔ اور انہیں اس کا حکم ماننا پڑتا ۔ دوسری طرف عدیل میاں جگہ جگہ رک کر حسین مناظر کو مووی کیمرے میں مقید کرنے میں مصروف تھے ۔ ان ہی شوخیوں اور خوش گپیوں میں نہ جانے کب ہماری گاڑیاں دائیں طرف دنوئی ریسٹ ہاؤس جانے والے راستے پر مڑنے کے بجائے سیدھی آگے چلی گئیں ۔ جبکہ فرحان اور نعیم دنوئی کے لئے مڑ گئے ۔ وہاں پہنچ کر انہیں احساس ہوا کہ باقی لوگ تو پیچھے ہیں ہی نہیں ۔ سو وہ دونوں وہاں سے واپس پلٹے ۔ اس دوران باقی گاڑیاں کافی آگے نکل گئیں ۔ آگے سڑک پر کام ہو رہا تھا ۔ ساری سڑک ادھڑی ہوئی تھی بلڈوزر اور بھاری مشینری مصروف کار تھیں ۔ گاڑیاں تھیں کہ بغیر سوچے سمجھے آگے ہی آگے چلی جا رہی تھیں ۔ فرحان، نعیم اور عدیل نے اپنی گاڑیاں ہوا کے دوش پر چھوڑ دیں اور ہارن بجا بجا کر سب کو متوجہ کر کے رکنے کا اشارہ کیا ۔ تب کہیں جا کر گاڑیاں رکیں ۔ اور سب کو معلوم ہوا کہ وہ دنوئی تو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ چنانچہ وہاں سے پھر سب واپس ہوئے ۔ سب

سے آگے فرحان وسلمان گائیڈ کررہے تھے۔ جبکہ نعیم واہل خانہ نے سب سے پیچھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس افراتفری میں کم ازکم آدھا گھنٹہ ضائع ہوگیا۔ تاہم منزل مقصود پر پہنچ ہی گئے۔

دنوئی موڑ سے ریسٹ ہاؤس تک کا راستہ بھی نہایت حسین اور ہرا بھرا تھا۔ ہر گوشہ سر سبز د شاداب اور اونچے اونچے درختوں سے گھرا قدرت کی صناعی کا مظہر تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے نزدیک ہمارے قافلہ کا استقبال زرد بلوط کے بلند ترین اور گھنے درخت نے کیا جو گزشتہ ایک صدی سے ایستادہ وہاں آنے والے تمام لوگوں کو خوش آمدید کہتا چلا آرہا ہے۔ یہ درخت عام طور پر شمالی امریکہ کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں دنوئی اور گردونواح کے پہاڑی علاقوں میں بھی اس کی بہتات ہے۔ یہاں آ کر پکی سڑک ختم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ یہیں تمام گاڑیاں قطار سے ایک دوسرے کے پیچھے پارک کردی گئیں۔ بڑوں اور نوجوانوں نے مل کر جلدی جلدی گاڑیوں سے سامان نکالا اور دائیں طرف نیچے اترتی چوڑی چوڑی سیڑھیوں کا رخ کیا کہ ریسٹ ہاؤس کی عمارت ابھی چوالیس سیڑھیوں کے فاصلے پر تھی۔ اور۔ بچوں کو تو جیسے قید سے رہائی مل گئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا طویل سفران کے لئے کسی صبر آزما امتحان سے کم نہ تھا۔ گاڑیوں سے اترتے ہی یہ رنگ برنگی تتلیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ اور شروع کردیا اپنا پسندیدہ کھیل۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے دوڑنے کا۔ سیڑھیوں کی تو ان کو ضرورت تھی نہ پروا۔ پہاڑی ڈھلان سے اچھلتے کودتے اور پھسلتے وہ ایسے نیچے جارہے تھے جیسے سالہا سال سے کوہ پیمائی کرتے آئے ہوں۔ ایک طرف فرحان میاں اپنی ٹیم کے ساتھ حلوہ پوری کی تیاری کے لوازمات، بڑے بڑے سلنڈر چولہے، کڑھائیاں، آلو چھولے سے بھری پتیلیاں اور دیگر سامان نیچے پہنچانے میں مصروف تھے۔ جبکہ دوسری طرف نعیم احمد، معز احمد اور دوسرے بچوں کے ہمراہ چائے سے متعلقہ اشیاء۔ سماوار اسٹو، دودھ، پانی، پتی، اور چینی وغیرہ نیچے لاکر اپنی سیٹنگ میں لگے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ تمام لوگ نیچے پہنچ گئے۔ اور ریسٹ ہاؤس کے وسیع سبزہ زار پر اپنی اپنی پسند کے گوشوں میں چادریں وغیرہ بچھا کر سامان سیٹ کرلیا۔ کچھ خواتین وحضرات نے برآمدے میں کرسیاں ڈال کر نشست کا انتظام کیا۔ جبکہ فہیم بھائی اور صاحبزادگان بڑی تگ ودو کے بعد اپنا خوبصورت ترنگا شامیانہ لگانے میں کامیاب ہو سکے کہ منہ زور ہوا اسے ٹکنے ہی نہیں دیتی تھی۔ شامیانے میں چٹائیاں اور چادریں وغیرہ بچھا دی گئیں تا کہ سب آرام سے بیٹھ سکیں۔ اسی دوران خواتین وحضرات

سفر کی تھکان دور کرنے اور پھر سے تروتازہ ہونے کیلئے پانی کی تلاش میں ہاتھ روم کا رخ کرتے رہے لیکن پانی وہاں بھی کمیاب تھا۔لہٰذا چھینٹوں پر ہی گزارا کرنا پڑا۔تاہم ان چھینٹوں نے بھی اکسیر کا کام کیا ۔اور لوگ ہشاش بشاش ہوکر ادھر ادھر گھوم پھر کر حسین نظاروں کو اپنی آنکھوں میں سمونے لگے۔

ان مناظر کی دلکشی اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب اچانک سامنے پہاڑیوں کی اوٹ سے کالی کالی گھٹائیں اٹھ کر گھن گرج کے ساتھ موٹی موٹی بوندوں کی شکل میں اللہ کی رحمت بن کر برسنے لگیں۔اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے فضاء معطر اور موسم خوشگوار ہوگیا۔جسموں میں جیسے نئی جان آ گئی۔سب لوگ سحر آگین موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے ادھر ادھر بکھر گئے۔جناب جمشید فرشوری واہل خاندان سہیل بھائی وانیلہ ان کے ہمراہ نو بیاہتا مہمان جوڑا، ناہید بھابی اور ان کے مہمانان گرامی، عظمیٰ اور بچے اور کئی دوسرے شرکاء سبزہ زار کے سامنے کی طرف ڈھلان پر سیر کے لئے نکل گئے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین کو ہموار چبوترے کی شکل دے کر بڑی بڑی کیاریاں بنائی گئی ہیں جن میں خوبصورت پھولدار پودوں اور زرد بلوط کی پنیریاں تیار ہو رہی تھیں۔اسی ڈھلان پر ایک جگہ دائرہ کی شکل میں چبوترہ بنا کر آنے والوں کے لئے باربی کیو کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ڈھلان پر تاحد نگاہ کیاریاں ہی کیاریاں ہیں جن پر شاہ بلوط کے آسمان سے باتیں کرتے درخت سایہ فگن ہیں۔ان درختوں کے تنے جو گلابی رنگ کے چھوٹے بڑے دائروں سے جن کے گرد باریک کالی لائن احاطہ کئے ہوئے ہے مزین ہیں یہ درخت ماحول کو مزید دلکش و رنگیں بناتے ہیں۔اظہر، خالد، اشعر، یاسر اور کچھ چھوٹے بچے ہائکنگ کرتے ہوئے ڈھلانوں پر کافی اوپر نکل گئے جبکہ نئی نویلی دلہن حنا اشعر، مریم اور ثروت وہیں خوش گپیاں کرتی رہیں۔وہاں بھی ہر طرف حسین قدرتی مناظر خالق کائنات کی عظمت کی گواہی دیتے نظر آتے تھے۔ایک اور گروپ نے جس میں بچے، بڑے اور بزرگ شامل تھے، وہیں سبزہ زار پر کرکٹ کا میدان سجالیا۔اور لگے، چوکے چھکے مارنے۔چھوٹے بچے بڑے جوش میں تھے۔اور بڑوں کو آؤٹ کر کے خوب شور مچا رہے تھے جبکہ بڑے بچارے مروت میں مارے جا رہے تھے۔منصور بھائی، شیخ صاحب، حسن سجاد صاحب اور حسن زیدی صاحب و دیگر حضرات و خواتین برآمدے میں تشریف فرما کرکٹ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ خوب داد دی جا رہی تھی، ابھی کھیل جاری ہی تھا کہ سہیل آصف صاحب نے نماز ظہر کا اعلان کیا۔سب کھیل بند کر کے وضو کرنے کے لئے دوڑ پڑے۔جناب سہیل آصف نے بڑی دلکش آواز میں اذان

دی۔لمحوں میں صفیں بندھ گئیں، امامت کے فرائض بھی سہیل صاحب ہی نے انجام دیئے۔تمام خواتین و حضرات نے نماز ادا کی۔

ٹائم اب کافی ہو چکا تھا۔سب کی آنتیں قل ھواللہ کا ورد شروع کر چکی تھیں۔لہٰذا فوراً ہی کھانے کے انتظامات شروع ہوگئے اور برآمدے میں حلوہ پوری کا سیٹ لگ گیا۔پوری بنانے والے نوجوان نے منا سا پیڑہ اٹھایا، دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر دبایا اور تھپ تھپ کی آواز کی لے پر سیکنڈوں میں بڑی سی پوری تیار کر کے گرم کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دی۔اور دوسری پوری کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن یہ کیا۔تیل سے تیار پوری نکالنے کے لئے وہاں ''چھوٹا'' تو تھا ہی نہیں۔کہ اتنے میں سامنے سے فرحان میاں آئے اور پوری نکالنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔اوہو۔تو اب سمجھ میں آیا یہ 'چھوٹا' کیوں غائب تھا۔۔!! یہ فرحان اور پوری بنانے والے کے درمیان ضرور 'لین دین' کا کوئی خفیہ معاہدہ تھا۔کیوں میاں فرحان۔! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔!ارے نہیں نہیں۔قارئین کرام۔! آپ سنجیدہ نہ ہوں۔یہ تو محض ایک مذاق تھا۔یہ فرحان اور نعیم احمد کا تعاون ہی تو تھا۔جو سب کو بروقت پوریاں ملتی رہیں۔شروع میں کچھ دقت پیش آئی۔لیکن 'Practice makes a man perfect' کے مصداق ان کی صلاحیت کو پر لگ گئے۔دوسرے لوگوں نے بھی قطار لگا کر سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ایک طرف چچا میاں سب کی پلیٹوں میں حلوہ ڈال رہے تھے۔جبکہ دوسری طرف آلو چھولے نعیم دے رہے تھے۔حلوہ پوری کے ساتھ ہی ساتھ گھر سے تیار کر کے لائے ہوئے کھانوں سے بھی لطف اٹھایا جاتا رہا ساتھ ہی کولڈ ڈرنکس چلتی رہیں۔اور یوں نہایت خوش اسلوبی سے کام و دہن کا یہ سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔آخر میں ریسٹ ہاؤس کے گارڈز اور چوکیدار وغیرہ کی جو ہیں عقب میں بنے ایک کوارٹر میں رہتے ہیں، حلوہ پوری سے ضیافت کی گئی۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی سب نے نعیم میاں کی زیر نگرانی تیار کردہ مزیدار چائے کا لطف اٹھایا کہ حلوہ پوری کھانے کے بعد بڑی شدت سے اس کی طلب ہو رہی تھی۔ابھی چائے کا گھونٹ بھرا ہی تھا کہ میری نظر سامنے سیڑھیوں کے ایک طرف منڈیر پر بیٹھی ہما سالاری پر پڑی۔وہ بڑے انہماک سے بیگم شہلا حسن زیدی کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھیں۔بس پھر کیا تھا۔ہم بھی پہنچ گئے وہاں۔دوسری طرف سے خالد راحیل اپنی بیگم ثروت راحیل کا ہاتھ پکڑے وہاں آن پہنچے۔اور ہم سب نے ہما کے سامنے اپنے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ہما۔تو۔جیسے یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا گئیں۔انہوں نے سوچا۔اگر ایسے دو چار

ہاتھ اور آ گئے تو پکنک کا تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے جلدی جلدی ہمارے ہاتھ دیکھے اور ایک آدھ بات بنا کر وہاں سے اٹھنے ہی میں عافیت جانی۔

چائے کا دور ابھی چل ہی رہا تھا کہ منصور بھائی نے اچانک ہی ایک اہم میٹنگ کا اعلان کرتے ہوئے سب کو برآمدہ کے سامنے سبزہ زار پر جمع ہونے کے لئے کہا۔ چنانچہ سب لوگ وہاں آ کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ بھائی صاحب اپنی نشست سے کھڑے ہوئے اور اللہ کے بابرکت نام سے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس خوبصورت موقع پر جبکہ مجلس عمومی کے معزز ممبران بھی موجود ہیں۔ اپنا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے ایک اہم فیصلہ سب کی باہمی رضامندی اور رائے سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مجلس منتظمہ میں ایک اور عہدہ سینئر وائس پریذیڈنٹ کی ضرورت پر زور دیا۔ اور اس سلسلے میں سب کی رائے مانگی۔ جناب سہیل آصف نے سب سے پہلے اور بعد میں تمام ممبران نے آپ کی تائید کی۔ ازاں بعد آپ نے سب کی متفقہ رائے سے محترم سید ممتاز اللہ سالاری صاحب کو وائس پریذیڈنٹ سے سینئر وائس پریذیڈنٹ کے عہدے کے لئے منتخب قرار دیا۔ سب نے پرجوش تالیاں بجائیں۔ اور اس کے بعد جب آپ نے نائب صدر کے لئے اچانک مجھ ناچیز کا نام تجویز کیا تو گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مجھ پر۔ میں تو حیران پریشان صرف نہیں۔ نہیں کہے جا رہی تھی کہ سہیل آصف صاحب کا ایک بار پھر تائیدی جملہ سنائی دیا جس پر سب نے زوردار تالیاں بجا کر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ چاروں طرف سے توصیفی کلمات کے ساتھ مبارکباد ملنے لگی۔ میں نے محترم منصور بھائی و دیگر تمام خواتین و حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا کہ ان سب نے مجھ پر اعتماد کیا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اعتماد پر پورا اترنے اور اپنی ذمہ داریاں خلوص نیت سے پوری کرنے کی توفیق عطاء فرمائے آمین۔

دنوئی ریسٹ ہاؤس میں پکنک اتنی دلچسپ اور مسحور کن تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ حسن بھائی، عدیل اور فہیم بھائی نے ان حسین مناظر اور خوبصورت لمحات کو عکس بند کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ فہیم بھائی نے تو آغاز سے لے کر انتہا تک ہر لمحے ہر گوشہ اور ہر خاندان کو مووی کیمرہ میں مقید کیا تھا۔ شام کے پانچ بجا چاہتے تھے۔ فضاؤں میں شام اتر رہی تھی۔ لہٰذا ان حسین و دلکش نظاروں کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ کرنا پڑا۔ سب نے اپنا اپنا سامان پیک کیا اور ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہتے ہوئے پارکنگ میں پہنچے اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

بیگم طیبہ آفتاب

گھریلو چٹکلے

O چہرے کو شاداب کرنے اور رنگت نکھارنے کے لئے:

ایک چھوٹے کھیرے کا رس نکال کر اس میں آدھی چائے کی چمچی عرق گلاب ملا لیں اور چہرے پر لگائیں جلد شگفتہ اور نرم ہو جائے گی۔ چہرے کی رنگت بھی کھل اٹھے گی کہ یہ نسخہ ایک طرح کا بلیچ بھی ہے۔

O چہرے اور گردن کی جھریاں دور کرنے کے لئے:

ایک انڈے کی سفیدی میں آدھا چمچ شہد ملا کر چہرے اور گردن پر لگا لیں۔ اس کے علاوہ تین چمچ کھیرے کا رس۔ ایک چمچ لیموں کا رس یا عرق گلاب باہم ملا کر فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔ اور چہرہ ہاتھ اور پیروں پر لگائیں آدھے گھنٹے بعد دھو لیں۔ ہاتھ پیر نرم ہو جائیں گے اور جھریاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

O جلنے کے نشانات دور کرنے کے لئے:

لیموں کے رس میں جو کا آٹا ملا کر پیسٹ بنا لیں اور جلی ہوئی جگہ کے نشانوں پر لگائیں۔ دو تین گھنٹے بعد دھو لیں کچھ عرصہ تک یہ عمل دہراتے رہیں۔ نشانات ختم ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں سرکہ اور عرق گلاب لگانا بھی مفید ہوتا ہے۔

O گاڑی کار یا بس کے سفر کے دوران چکر آئیں تو:

ایسی صورت میں منہ میں لونگ یا دار چینی رکھ کر چوسنے سے چکر آنا بند ہو جائیں گے اور قے بھی نہیں ہوگی۔ ایسے حضرات کو سفر کے دوران دار چینی یا لونگ ساتھ رکھنی چاہیئے۔

O پیٹ میں گڑبڑ ہونے کی صورت میں

تھوڑی سی اجوائن رات کو پانی میں بھگو دیں۔ صبح نہار منہ یہ پانی پی لیں۔ دوسرے دن پھر اسی اجوائن میں پانی ڈال کر رات بھر رکھیں۔ اور صبح نہار منہ پی لیں۔ یہ عمل ایک ہفتہ تک روزآنہ کرنے سے پیٹ کی گرمی جاتی رہے گی اور پیٹ نارمل ہو جائے گا۔

پیو ٹھنڈا ٹھنڈا،
بولو میٹھا میٹھا!
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
ہمدرد
ہمدرد لیباریٹریز (وقف) پاکستان
ISO 9001: 2000 CERTIFIED
www.hamdard.com.pk
SHARBAT
ROOH AFZA

Karachi Port Trust
Gateway to Pakistan
A Great Heritage - A Vibrant Future

ڈنوئی ریسٹ ہاؤس کے حسین وپُر فضا مناظر کے درمیان
'الاقرباء فاؤنڈیشن' کے اراکین کی پکنک کی تصویری جھلکیاں

ISSN 1812-8734
Quarterly **AL-AQREBA** Islamabad

ISLAMABAD REGISTERED NO. 252

Contributing to the national agenda on self reliance

A literary, Academic, educational & socio-cultural magazine of Al-Aqreba Foundation, Islamabad.

House # 464, Street 58, I-8/3, Islamabad.